Phone : 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل ۱۹۵۹ء

رزق میں مساوات

حضرت ابو موسیٰ (رض) سے روایت ہے کہ اشعر کے قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے پاس کھانا تھوڑا رہ جاتا یا مدینے میں ان کے بال بچوں پر فاقہ کی نوبت آ جاتی تو یہ لوگ سب اپنے اپنے کھانوں کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔

رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں۔ اور میں ان سے ہوں۔

(بخاری و مسلم)

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ رُبوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

بدل اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے ۸ آٹھ روپے
غیر ممالک سے ۱۴ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہند و پاکستان سے
بارہ آنے

ٹیلی فون ۷۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ: ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵ - بی گلبرگ کالونی لاہور

جلد ۱۲ || اپریل سنہ ۱۹۵۹ء || نمبر ۴

فہرست مضامین

لمعات	۲
تعلیمی کمیشن کے سوالنامے کا جواب	۱۷
طلاق کے متعلق ایک نہایت مستحسن فیصلہ	۲۳
یتیم پوتے اور زرعی اصلاحات	۲۴
مجلس اقبال	۲۵
قرآن کی حقیقت	۳۴
کیا اخلاقِ رذیلہ کے بیشتر اسبابِ اقتصادی نہیں؟	۴۲
حقائق و عبر	۴۷
(۱) ولادت حضرت امام مہدی	
(۲) احادیث کیوں گھڑی گئیں	
(۳) موسیقی کے متعلق فتویٰ	
(۴) نماز کی تفاصیل	
اسلام کی سرگزشت	۵۵
رابطہ باہمی و طلوعِ اسلام کنونشن	۶۵
باب المراسلات	۷۵
(۱) محترم سید نذیر نیازی کا گرامی نامہ۔ (۲) روزہ کے احکام	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

(آئینِ پاکستان)

دگر از سر گرفتم قصۂ زلفِ چلیپا را

جب غیر منقسم ہندوستان میں سیاسی تبدیلیوں کا امکان نمایاں طور پر سامنے آیا تو مسلمانوں کے دل میں اس آرزو نے انگڑائی لی کہ یہ تبدیلیاں اس نہج سے ہونی چاہئیں کہ ہم اپنے تصورات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ چونکہ اسلامی تصورات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے ایک آزاد خطۂ زمین (مملکت) کی ضرورت اساسی اور لابدی ہوتی ہے، اس لئے مسلمانوں نے حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی کی عطا کردہ فکر کی روشنی میں ایک جداگانہ مملکت کا حصول اپنی سیاسی سعی و کاوش کا نصب العین قرار دیا اور قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کی راہ نمائی میں نو برس کی مسلسل جدوجہد کے بعد، وہ اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو گئے۔ یوں پاکستان کا وجود عمل میں آیا۔

حصولِ پاکستان کے تھوڑے عرصہ بعد (ہماری بدقسمتی سے) قائدِ اعظمؒ فوت ہو گئے۔ اس کے بعد یہ سوال سامنے آیا کہ جن تصورات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا ہے انہیں متعین طور پر آئینی شکل دے دی جائے تاکہ ہماری حیاتِ نو کی عمارت اُس نقشے کے مطابق استوار ہو جائے۔ چھیڑنے کو تو یہ بات چھڑ گئی لیکن دیکھنے والوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ جن اربابِ بست و کشاد نے مسلسل دس برس تک "اسلامی تصورِ حیات" (آئیڈیالوجی) کا نعرہ بلند کیا تھا، انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسلامی تصورِ حیات کہتے کسے ہیں۔ اقوامِ عالم کی تاریخ میں اس کی مثال شاید ہی کہیں ڈھونڈے سے مل سکے کہ ایک قوم نے ایک مقصد کے حصول کے لئے کوئی مطالبہ کیا ہو اور جب وہ اس کے حصول میں کامیاب ہو گئی ہو تو اسے

یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ مقصد کیا تھا جس کے لئے وہ مطالبہ کیا گیا تھا۔ ان حضرات کی پریشانیٔ فکر و نظر اس حد تک پہنچ گئی کہ ان میں سے بعض نے یہاں تک کہنا شروع کر دیا کہ اسلامک آئیڈیالوجی (اسلامی تصورِ حیات) کا دعویٰ محض ایک ڈھکوسلہ تھا جسے مسٹر جناح نے سیاسی مقدمہ جیتنے کے لئے اختیار کیا تھا ورنہ درحقیقت اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ بہرحال، تدوینِ آئین کی کشتی بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح، کامل نو سال تک ایک ہی مقام پر چکر کاٹتی رہی۔ بالآخر جب حالات نے سخت مجبور کر دیا تو کسی نہ کسی طرح ایک آئین منظور ہوا جس میں اُس آئیڈیالوجی کی کوئی جھلک نہ تھی جس کا مظہر اس آئین کو قرار دیا گیا تھا۔ بایں ہمہ، اُس وقت کی برسرِاقتدار پارٹی نے اس آئین کو ایک محیر العقول کارنامہ قرار دیا اور علمائے کرام نے اس پر اسلامی آئین ہونے کی مہرِ تصدیق ثبت کر دی اور فتویٰ صادر فرما دیا کہ اس سے مملکت مسلمان ہو گئی ہے۔ یہ آئین ہنوز گھٹنیوں بھی چلنے نہ پایا تھا کہ ملک میں عسکری انقلاب آ گیا۔ اس انقلاب کی رُو سے ملک میں جو دوسری تبدیلیاں ہوئیں ان سے قطع نظر ہمارے نزدیک اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس آئین کو کالعدم قرار دے دیا جسے اسلامی آئیڈیالوجی کا مظہر قرار دے کر قوم کی آنکھوں میں دھول ڈالی گئی تھی۔ اس آئین کے منسوخ ہو جانے سے قوم پھر اُسی مقام پر کھڑی ہو گئی جہاں وہ سنہ ۱۹۴۷ء میں تھی یعنی قوم کے پاس ایک مملکت ہے جس کا آئین مرتب کیا جانا ہے۔

یہ امر موجبِ صد اطمینان ہے کہ موجودہ اربابِ حل و عقد کے دل میں نہ صرف آئین مرتب کرنے کا خیال ہے بلکہ ایک ایسا آئین مرتب کرنے کا خیال ہے جو صحیح معنوں میں اس آئیڈیالوجی کا مظہر ہو جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا ہے۔ چنانچہ صدرِ محترم جنرل محمد ایوب خاں، صدرِ مملکتِ پاکستان نے ۲ مارچ کو راولپنڈی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

> ہمارا سب سے مقدم فریضہ یہ ہے کہ ہم اُس آئیڈیالوجی کا احیاء اور استحکام کریں جس کی رُو سے پاکستان بحیثیت ایک آزاد مملکت کے وجود پذیر ہوا۔ پاکستان محض ایک خطۂ زمین کا نام نہیں جس میں آٹھ کروڑ نفوس بستے ہیں۔ پاکستان سے ہماری مراد ایک ایسی ملت ہے جو مخصوص اخلاقی اور روحانی اقدار کی امین ہے۔ یہ اقدار اسلام پر مبنی ہیں۔ ہمارے تجدد پسند حضرات کے نزدیک اسلام کا نام لینا فیشن کے خلاف اور قدامت پرستی کی دلیل ہے۔ یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان پر ترس کھایا جائے۔ اس کے برعکس یہ امر ہمارے لئے موجبِ صد ہزار فخر و مباہات ہونا چاہیئے کہ ہم ایسے مذہب کے پیرو ہیں جو ہمیں اس قسم کی بلند اقدار کی تعلیم دیتا ہے۔ مثلاً خدا ترسی۔ نوعِ انسانی سے محبت۔ ہمسایہ سے مودّت۔ یتامیٰ کی نگہداشت اور غریبوں کی امداد۔ یہ اسلام کی وہ بنیادی اقدار ہیں جن کے بغیر نہ تم اچھے انسان بن سکتے ہو، نہ اچھے پاکستانی۔
>
> (بحوالہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۳/۳/۵۹)

لیکن جہاں ایک طرف اس قسم کی مقدس آرزوؤں اور مبارک عزائم کا اظہار ہو رہا ہے، دوسری طرف وہ خدشات بھی ابھر کر سامنے آ رہے ہیں جن کے پیشِ نظر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس ملک میں اس قدر مختلف الخیال والعمل مذہبی فرقے موجود ہوں، اس میں ایک متفق علیہ اسلامی آئین کا مرتب کیا جانا مشکل ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں محترم منظور قادر صاحب (وزیر امورِ خارجہ)

نے گذشتہ دنوں اپنی مختلف تقاریر و مباحث میں بعض مقامات پر اجمالاً اور بعض پر تفصیلاً جو کچھ کہا ہے وہ اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ مثلاً انھوں نے پشاور میں فرمایا کہ

اگر آئین پاکستان کی بنیاد اسلامی تصور حیات قرار پاتی ہے تو اس سلسلہ میں بہت سی دشواریاں سامنے آتی ہیں۔ اسلامی اقدار کی تعریف (DEFINITION) کیا ہے اس کے متعلق دو علماء بھی باہم متفق نہیں۔

(پاکستان ٹائمز مورخہ $\frac{3}{59}$ ۱۳)

اس سے دو دن قبل انھوں نے لاہور میں فرمایا کہ

میں نے قانون شریعت کے سلسلہ میں یہ بات کہی تھی کہ اس باب میں کسی متفق علیہ فیصلہ پر پہنچنا ممکن نہیں۔ اس وقت مسلمانوں میں بہتر اور بعض کے نزدیک پچھتر فرقے ہیں جن میں سے ہر ایک کا دعوے ہے کہ قرآنی آیات کی جو تعبیر وہ پیش کرتے ہیں بس وہی صحیح ہے۔ فسادات پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی نے نہایت واضح الفاظ میں لکھا تھا کہ جب علمائے کرام سے پوچھا گیا کہ "مسلمان کسے کہتے ہیں" تو ان میں سے ہر ایک کا جواب دوسرے سے مختلف تھا یہ ایک حقیقت ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

(پاکستان ٹائمز $\frac{3}{59}$ ۱۱)

اس کے بعد انھوں نے کہا کہ پہلی مجلس آئین ساز، تدوین آئین کے معاملہ میں ناکام رہی تھی۔ ریکارڈ سے یہ بات معلوم ہوتی کہ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اس بات پر اتفاق ہی نہیں ہوتا تھا کہ اسلامی آئین کا صحیح تصور کیا ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ ۱۹۵۶ء کے آئین پاکستان میں اسلامی دفعات محض ایک قرارداد کی شکل میں رکھ دی گئی تھیں اور یہ بات کبھی چھپی نہیں کہ یہ کچھ محض عوام کے جذبات کی تسکین کے لئے کیا گیا تھا۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز مورخہ $\frac{3}{59}$ ۱۱)

محترم منظور قادر صاحب نے جس صورت حالات کا ذکر کیا ہے اسے دیکھنے کے لئے کسی خوردبین کی ضرورت نہیں۔ ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے کہ مسلمانوں میں بہت سے فرقے موجود ہیں۔ ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر اور باقی فرقوں کو باطل پرست قرار دیتا ہے۔ ان کے اختلافات کی یہ کیفیت ہے کہ آئے دن ایک دوسرے کے خلاف تکفیر و تفسیق کے فتاوی صادر ہوتے رہتے ہیں۔ اختلافات بڑھ کر فسادات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مار پیٹ اور قتل و خوں ریزی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس قسم کی فرقہ پرستی کی موجودگی میں یہ کہنا بے بنیاد ہے نہ مبالغہ آمیز کہ ایسا آئین مرتب کرنا مشکل (بلکہ ناممکن) ہے جس پر ان تمام فرقوں کے نمائندوں کا اتفاق ہو اور اسے صحیح معنوں میں اسلامی آئین کہا جا سکے۔ لیکن ہمارے ارباب شریعت کی حالت عجیب ہے۔ وہ باہمی جنگ و جدل کے "جہاد عظیم" میں مصروف بھی رہتے ہیں اور جب کوئی یہ کہے کہ اُن کے ان تفرقوں کی موجودگی میں امت میں اتحاد و اتفاق ناممکن ہے تو اس سے انھیں بہت غصہ آجاتا ہے۔ چنانچہ وزیر خارجہ کی مندرجہ بالا تصریحات کے خلاف ہمارے ارباب مذہب کی طرف سے اسی ردعمل کا مظاہرہ ہوا۔ کراچی سے احتشام الحق صاحب (خطیب

مسجد حبیب لائن) نے ایک بیان اخبارات میں شائع کرادیا۔ لاہور میں (سابق جماعت اسلامی کے نقیب) معاصر ایشیا[1] نے اپنی ۸ مارچ کی اشاعت میں اور جماعت اہلِ حدیث کے ترجمان، معاصر منہاج نے ۳ مارچ کی اشاعت میں مقالات افتتاحیہ شائع کئے۔ ان میں کہا گیا ہے کہ مسلمانوں میں بے شک مختلف فرقے موجود ہیں۔ ان کے فقہی مدارس میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایک ایسا اسلامی آئین مرتب کیا جا سکتا ہے جو ان سب کے نزدیک متفق علیہ ہو اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۵۱ء میں کراچی میں اکتیس (۳۱) علماء نے اسلامی آئین کا متفقہ مطالبہ کیا تھا اور اس کے مطابق ایک ایسا آئین مرتب ہو گیا تھا جس پر اپنے باہمی اختلافات کے باوجود تمام مکاتب فکر کے علماء و عوام نے تصدیق کی مہر ثبت کر دی تھی" (منہاج)

جو کچھ محترم وزیرِ خارجہ نے کہا اور اس کا جو جواب ہمارے ان اربابِ شریعت کی طرف سے دیا گیا، اس سے حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ جس مملکت میں مسلمانوں کے مختلف فرقے موجود ہوں کیا وہاں اسلامی آئین مرتب ہو سکتا ہے؟

۲۔ کیا سنہ ۱۹۵۶ء کا آئین اسلامی تھا؟

۳۔ اگر سوال (۱) کا جواب نفی میں ہے تو پھر کیا پاکستان میں اسلامی آئین کی تدوین ممکن ہے؟ اگر ممکن ہے تو اس کا طریقہ کیا ہے؟

یہ سوالات بڑے اہم ہیں اور اس قابل کہ ان پر پوری سنجیدگی سے غور و فکر کیا جائے۔ اس لئے کہ آئین کا معاملہ بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کا تعلق قوم کی پوری زندگی اور آنے والی نسلوں کے مستقبل سے ہے۔ نہ ہی یہ مذہبی مناظرہ ہے کہ اس میں لفظی گورکھ دھندوں سے اپنے متبعین کو خوش کر لیا جائے۔ یہ ایک ٹھوس تجربہ ہے جسے تیرہ سو سال بعد پہلی مرتبہ عمل میں لایا جا رہا ہے اور جس کی طرف ساری دنیا کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ اگر یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو اس سے دنیا اس نتیجہ پر پہنچے گی کہ اسلام ایک ممکن العمل ضابطۂ زندگی ہے جو آج بھی اپنے نتائج مرتب کر سکتا ہے۔ اگر یہ ناکام رہا تو دنیا ہمارے متعلق جو رائے قائم کرے سو کرے۔ خود اسلام کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ یہ کسی دور میں تو قابلِ عمل تھا لیکن اب اس میں یہ صلاحیت نہیں کہ یہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ اندریں حالات یہ مسئلہ جذبات کی رُو سے طے کرنے کا نہیں۔ کامل غور و فکر اور متانت و سنجیدگی سے حل کرنے کا ہے۔

آیئے ہم مندرجہ بالا سوالات پر غور کریں۔

سب سے پہلے فرقہ پرستی کو لیجئے۔ قرآن کریم نے تمام مسلمانوں سے کہا ہے کہ ہم نے تمہیں ایک امت بنایا ہے وَكَذٰلِكَ

---

[1] ایشیا کے الفاظ یہ ہیں۔ "جس پر علماء و فضلاء سب نے اسلامی آئین ہونے کی مہر ثبت کر دی"

جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (یا) كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ) یعنی تمام مسلمان امت واحدہ ہیں۔ اس لئے ان کا ایک سے زیادہ حصوں میں بٹ جانا منشائے خداوندی کے خلاف ہے۔ اسی مقصد کے لئے اس نے انھیں تاکیدی حکم دیا ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۳) یعنی تم سب مل کر اللہ کی رسی کو تھامے رکھو اور آپس میں تفرقہ مت پیدا کرو۔ اس آیت میں حبل اللہ واحد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دین ایک غیر منقسم وحدت ہے جس کے نہ ٹکڑے ہو سکتے ہیں نہ متفرق حصے۔ "وَاعْتَصِمُوْا" میں جمع کا صیغہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام مسلمان ایک ہی مسلک پر کاربند رہیں گے۔ علاوہ ازیں "جمیعاً" کے اضافے نے اس میں اور بھی تاکید پیدا کر دی ہے۔ یہاں تک مثبت حکم تھا۔ اس کے آگے وَلَا تَفَرَّقُوْا کہہ کر بات میں وضاحت اور حکم میں مزید تاکید پیدا کر دی۔ اسی حکم کی تصریح دوسرے مقام پر ان الفاظ سے کر دی۔ "وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۚ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ" (۳/۱۰۴) یعنی اے مسلمانو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کی طرف سے واضح احکام آجانے کے بعد باہمی تفرقہ پیدا کر لیا اور ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگ گئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر خدا کا بہت بڑا عذاب ہے۔" اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی اور امت میں باہمی اختلاف خدا کا عذاب ہے[1] اس سے بھی آگے بڑھئے۔ سورۂ روم میں ہے "وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا (۳۰/۳۱) اے مسلمانو! دیکھنا کہیں تم بھی مشرکین میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن بیٹھے۔ جب کسی قوم میں فرقے پیدا ہو جائیں تو ان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ اپنے مسلک کو حق و صداقت کا مسلک سمجھ کر اس میں مگن رہتا ہے اور دوسروں کے متعلق سمجھتا ہے کہ وہ سب باطل ہیں۔"

آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم فرقہ بندی کو شرک قرار دے رہا ہے۔ اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایک خدا اور ایک ضابطۂ حیات پر ایمان رکھنے کا لازمی نتیجہ امت کی وحدت ہے۔ اگر امت فرقوں میں بٹ جاتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کے مقرر کردہ ضابطۂ حیات پر کاربند نہیں رہتی۔ اسی کا نام شرک ہے۔ اُمّت میں فرقے پیدا کر لینا ایسا سنگین جرم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بالفاظ صریح کہہ دیا گیا کہ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ (۶/۱۶۰) یعنی جو لوگ دین میں فرقے پیدا کر لیں اور خود ایک گروہ بن بیٹھیں اے رسول تجھے ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ چنانچہ غالی سے غالی فرقہ پرست بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ رسول اللہ کے زمانے میں امت میں فرقے تھے۔

آپ قرآن کریم کی ان تصریحات کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا اس بات کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ ایک

---

[1] اختلاف امتی رحمۃ کو حدیث قرار دینے والے ذرا اس ارشاد خداوندی کو سامنے رکھیں۔

مملکت میں مسلمان مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ہوں۔ ہر فرقہ اپنی مستقل ہیئت کو برقرار رکھے۔ اور اس کے باوجود اس مملکت یا اس کے آئین اور نظام کو اسلامی کہا جائے؟ یہ دو متضاد باتیں ہیں جو ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ مملکت وہی اسلامی کہلا سکتی ہے جس کے اندر تمام مسلمان امتِ واحدہ کی حیثیت سے رہیں۔ ان میں کوئی فرقہ نہ ہو۔ یہی شکل کتاب اللہ کے مطابق ہے اور یہی سنت رسول اللہ کے مطابق۔ امت میں فرقوں کا وجود قرآن کے بھی خلاف ہے اور سنت رسول اللہ کے بھی خلاف۔

ہمارے ارباب شریعت نے ۱۹۵۱ء کی جس علماء کانفرنس کا ذکر کیا ہے آپ کو معلوم ہے کہ اس کانفرنس کا متفق علیہ فیصلہ اور مطالبہ کیا تھا؟ وہ مطالبہ یہ تھا کہ پاکستان کے آئین میں مختلف فرقوں کی حیثیت کو قانوناً تسلیم کیا جائے اور "پرسنل لا" کے متعلق ہر فرقے کی تعبیر کو صحیح قرار دیا جائے۔ مجلس آئین ساز نے ان کے اس مطالبہ کو منظور کر لیا اور یہ آئین میں شامل ہو گیا۔ یہ تھا وہ آئین جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ تمام علماء و فضلاء نے اس کے اسلامی آئین ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اور اسی قسم کے آئین کا اب پھر مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس قسم کا آئین جس میں مختلف فرقوں کے وجود کو آئینی ضمانت دیدی جائے اسلامی آئین ہو سکتا ہے تو جس چیز کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے وہ کیا ہے؟ آپ نے اس سے دیکھ لیا ہو گا کہ ہمارے ارباب شریعت کا یہ دعویٰ کہ (۱) بہتر فرقوں کے علی الرغم اسلامی آئین بن سکتا ہے (۲) ایسا آئین ۱۹۵۶ء میں بنایا گیا تھا اور (۳) اگر اسی آئین کو پھر سے نافذ کر دیا جائے تو وہ اسلامی آئین ہو گا۔ اگر واقعہ فریب دہی نہیں، تو اتنی بڑی خود فریبی ہے جس کی مثال نہیں مل سکتی۔ یہ لوگ اس بات کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں کہ ۱۹۵۱ء میں بہتر فرقوں کے علماء آپس میں متحد ہو گئے تھے۔ لیکن آپ سوچئے کہ ان کا یہ اتحاد و اتفاق کس بات کے لئے تھا؟ اس بات کے لئے کہ ان کے اختلافات کو آئینی طور پر تسلیم کر لیا جائے۔ اگر اسی کا نام اتفاق ہے تو معلوم نہیں پھر اختلاف کسے کہا جائیگا؟ آپ دیکھئے کہ کتنا بڑا دھوکا ہے جو یہ حضرات عوام کو دے رہے ہیں؟ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ (تو خیال کریگا کہ وہ سب متحد ہیں حالانکہ ان کے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں) قرآن مجید میں غالباً ایسے ہی مواقع کے لئے آیا ہے۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ محترم منظور قادر صاحب نے مسلمانوں میں جس اختلاف اور تفریق کا ذکر کیا ہے وہ ایک امر واقعی ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان حالات کے باوجود ایک ایسا آئین بنایا جا سکتا ہے جسے قرآن کی رو سے اسلامی آئین کہا جائے؟ ہمارا دعویٰ ہے (اور یہ دعویٰ ذاتی نہیں بلکہ قرآن کی تعلیم پر مبنی ہے) کہ ایسا آئین بنایا جا سکتا ہے۔ نظر بظاہر یہ دعویٰ بہت بڑا ہے لیکن ہم اسے پوری ذمہ داری کے احساس کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ ہر رسول آتا اور امتِ واحدہ متشکل کر کے جاتا۔ لیکن اس کے بعد ان میں تفرقہ پیدا کر دیا جاتا۔ وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (۴۲/۱۴)، یہ تفرقہ اس لئے پیدا ہوتا کہ

انھیں تعلیم خداوندی کے بارے میں کوئی التباس یا ابہام پیدا ہو جاتا۔ وہ تعلیم واضح انداز میں ان کے سامنے ہوتی لیکن ان کی باہمی ضد سرکشی اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا جذبہ فرقہ بندی اور گروہ سازی کا موجب بنتا۔ نزول قرآن کے وقت مختلف مذہبی امتوں کی یہی حالت ہو چکی تھی۔ ان حالات میں قرآن نازل ہوا جس کا مقصد یہ بتایا گیا کہ وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۶/۶۴) اس کتاب کو نازل اس لئے کیا گیا ہے کہ جن امور میں لوگ اختلاف کرتے ہیں انھیں نمایاں طور پر سامنے لایا جائے اور اس طرح جو لوگ اس کتاب کی صداقت پر ایمان لے آئیں یہ ان کے لئے صحیح رہنمائی اور رحمت کا موجب بن جائے۔ اس سے واضح ہے کہ نزولِ قرآن سے مقصد اختلافات کا مٹانا تھا اور ہمارا ایمان ہے کہ اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ یہ اختلافات کو مٹا سکے۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا "وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (۴۲/۱۰) جس بات میں بھی تم میں اختلاف پیدا ہو جائے اس کا فیصلہ اللہ کی کتاب سے کرا لیا کرو

اس مقام پر یہ کہہ دیا جائے گا کہ اختلافات مٹانے کے لئے قرآن سے فیصلہ کس طرح لیا جائے جبکہ ان بہتر فرقوں میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ اس کا مسلک قرآن کے مطابق ہے۔ یہ اعتراض واقعی اہم ہے اور اس قابل کہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴/۸۲) یعنی اگر قرآن خدا کے علاوہ کسی اور طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات پائے جاتے۔ بالفاظِ دیگر قرآن نے اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ پھر اس نے یہ بھی کہا ہے کہ میری تعلیم صاف اور واضح ہے۔ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں۔ ابہام نہیں۔ التباس نہیں۔ ریب نہیں۔ تشکیک نہیں۔ قرآن کریم کے ان دعاوی کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کی طرف سے دو متضاد باتوں کی کبھی تائید نہیں مل سکتی۔ چہ جائیکہ بہتر متضاد مسالک کو اس کے یہاں سے تائید مل جائے۔ قرآن نے جب کہا ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں تو اس کا فقط یہ مطلب نہیں کہ اس کی آیات میں لفظی اختلاف نہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس کے قوانین میں بھی اختلاف نہیں۔ اسکی رہنمائی میں اختلاف نہیں۔ یعنی وہ دو مختلف راستوں کی طرف رہنمائی نہیں کرتا اس کا بتایا ہوا راستہ ایک ہی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جہاں تک بسیط حقائق (ABSTRACT TRUTHS) کا تعلق ہے قرآن نے انھیں (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) تمثیلات، استعارات کے انداز میں بیان کیا ہے۔ ان مجرد حقائق کی مختلف ادوار میں نئی نئی تعبیریں کی جا سکتی ہیں لیکن جہاں تک عملی زندگی سے متعلق اصول و ضوابط کا تعلق ہے، قرآن نے انھیں متعین اور دو ٹوک انداز میں بیان کیا ہے جن میں مختلف تعبیرات کی گنجائش نہیں۔ مثلاً اس نے خدا کے متعلق کہا ہے کہ كَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (اس کا عرش پانی پر ہے)۔ یہ ایک مجرد حقیقت ہے جسے استعارہ کی زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دور میں یہ سمجھا گیا ہو کہ اس کا سچ مچ کا ایک تخت ہے جو پانی پر تیر رہا ہے لیکن

دوسرے دور میں اس سے یہ مفہوم لیا گیا ہو کہ پانی زندگی کا سرچشمہ ہے اور زندگی کے سرچشمہ پر کنٹرول صرف خدا کا ہے۔ لیکن جہاں اس نے کہا ہے کہ اَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ (امت کے معاملات باہمی مشورہ سے طے ہوں گے) تو اس اصول یا قانون کی دو تعبیریں ہو ہی نہیں سکتیں۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ زندگی کے عملی مسائل سے متعلق جو کچھ قرآن کریم میں آیا ہے اس کی متعدد تعبیریں کی جا سکتی ہیں، قرآن کی تعلیم سے ناواقفی کی دلیل ہے یا اس پر پردہ پوشی کی کوشش سے۔ اگر قرآن فی الواقعہ ایسا ہے کہ اس سے متضاد مسالکِ زندگی کو تائید مل جائے تو وہ خود (اپنے دعویٰ کی بنا پر) اس قابل نہیں رہتا کہ اسے خدا کی کتاب تسلیم کیا جائے۔ بالفاظِ دیگر اگر مختلف فرقوں کے اس دعوے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ ان کا مسلک قرآن کے مطابق ہے تو قرآن کا یہ دعوے باطل قرار پا جاتا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر زندگی کے عملی معاملات کے متعلق دو افراد کسی قرآنی حکم کی دو مختلف تعبیریں پیش کریں تو اس کا فیصلہ کس طرح سے کیا جائے کہ کون صحیح کہتا ہے اور کون غلط؟ اس سلسلہ میں قرآن کا کہنا یہ ہے کہ دین انفرادی چیز نہیں کہ جس فرد یا گروہ کا جس طرح جی چاہے اس کی تعبیر کرتا جائے۔ دین زندگی کا اجتماعی نظام ہے جو ایک مرکز کے تابع قائم ہوتا ہے اور یہ اختیار صرف اس مرکز کو حاصل ہوتا ہے کہ وہ فیصلہ کرے کہ فلاں معاملہ میں قرآن کا فیصلہ کیا ہے۔ "وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ" کے معنی یہ ہیں کہ ہر اختلافی معاملہ میں اسلامی حکومت کی طرف رجوع کیا جائے۔ اور وہ بتائے کہ اس بات میں اللہ کا فیصلہ یعنی کتاب اللہ کا حکم کیا ہے۔ مرکز کا یہ فیصلہ ہر ایک کے لئے واجب الاتباع ہوگا۔ یہ تھی دین کی وہ شکل جو نبی اکرمؐ کے زمانے میں قائم ہوئی تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ امت میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ تقسیم سے پہلے ہم ہندوستان میں انفرادی زندگی بسر کرتے تھے جس میں قدیم فرقوں کے بقا اور نئے فرقے پیدا ہونے کا امکان ہر وقت موجود تھا۔ ہماری وہ زندگی غیر اسلامی تھی۔ اس زندگی کو اسلامی زندگی میں تبدیل کرنے کے لئے اسلامی مملکت کی ضرورت تھی اور اسی کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس مطالبہ سے مقصد یہ تھا کہ اس خطۂ زمین میں ایسی اسلامی حکومت قائم کی جائے جو یہاں کے مسلمانوں کو امتِ واحدہ بنا کر خدا کے قانون کے مطابق چلائے۔ لیکن اگر ہم اب یہ کہنا شروع کر دیں کہ جب تک یہاں فرقے موجود ہیں اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی، پہلے فرقے مٹاؤ، پھر اسلامی آئین مرتب ہوگا تو یہ ایسی ہی بات ہوگی جیسے کوئی کہے کہ میں پانی میں اس وقت اتروں گا جب مجھے تیرنا آ جائے گا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ہمیں ایک جداگانہ آزاد مملکت کی تو ضرورت ہی اس لئے پیش آئی تھی کہ اس کے بغیر فرقے مٹ کر امتِ واحدہ کی اسلامی زندگی کا امکان نہیں تھا۔ لہٰذا فرقے، اسلامی حکومت کے قیام سے مٹیں گے یہ نہیں ہوگا کہ پہلے فرقے مٹ جائیں اور پھر اسلامی حکومت قائم ہو۔

یہ ہے صورتِ حالات کی صحیح تصویر۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بجائے اس کے کہ قوم اپنی توانائیوں کو غیر متعین مباحث میں ضائع کرتی رہے، ارباب بست و کشاد کو چاہیئے کہ مسئلہ آئین کے مبادیات و تضمنات پر سکون سے غور و فکر کے

بعد کسی نتیجہ پر پہنچیں۔ اور اس کے بعد اپنے لئے لائحہ عمل تجویز کریں۔ غور طلب نکات یہ ہیں کہ

(۱) کیا یہ حقیقت ہے یا نہیں کہ قرآن کریم اللہ کی کتاب ہے اور دین میں اس کی حیثیت اساسی اور بنیادی ہے۔

(۲) کیا یہ ٹھیک ہے یا نہیں کہ قرآن کریم کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے۔

(۳) کیا یہ بھی حقیقت ہے یا نہیں کہ رسول اللہ کے زمانہ میں امت میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔

اگر ان سوالات کا جواب مثبت میں ہے (اور اس کے سوا دوسرا جواب ہو کیا سکتا ہے) تو پھر اس حقیقت کے اعتراف میں کسی کو اختلاف نہیں ہونا چاہیئے کہ اسلامی مملکت میں تمام مسلمان امت واحدہ کی شکل میں ہوں گے۔ اس میں فرقوں کا وجود نہیں ہوگا۔

اب آگے بڑھیئے۔ سوال یہ ہے کہ

(۴) کیا ہم پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا چاہتے ہیں یا نہیں۔

اگر اس سوال کا جواب مثبت میں ہے تو اس منطقی نتیجہ سے بھی کسی کو اختلاف نہیں ہونا چاہیئے کہ اسلامی مملکت پاکستان کا فریضہ ہوگا کہ وہ فرقوں کو مٹا کر مسلمانان پاکستان کو ایک امت بنائے۔

اگلا سوال یہ ہے کہ مسلمان اس وقت جس طرح فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، اس کی موجودگی میں

(۵) کیا فرقوں کا مٹا دینا ممکن ہے؟

اگر ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا ممکن نہیں، درآنحالیکہ قرآن ہمارے پاس موجود ہے، تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ ہمارے نزدیک

(ا) قرآن میں کبھی یہ صلاحیت تھی کہ وہ اختلافات مٹائے لیکن اس میں (معاذ اللہ) اب وہ صلاحیت نہیں رہی

اور

(ب) اسلامی نہج زندگی (جس میں تمام مسلمان ایک امت کی حیثیت سے رہتے تھے) کسی سابقہ دور میں تو ممکن تھی لیکن اب اس کا کوئی امکان نہیں۔

بالفاظ دیگر، ہمیں اس کا اعتراف کرنا ہوگا کہ اب اسلامی مملکت کا قیام ناممکنات میں سے ہے۔

لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ اسلامی مملکت کا قیام (اور فرقوں کو مٹا کر امت واحدہ کی تشکیل) ممکن تو ہے۔ لیکن اس میں دشواریاں بہت ہیں تو اس سے یہ سوالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ

(۶) کیا ہم دشواریوں کے پیش نظر اسلامی مملکت کے قیام کا خیال چھوڑ دیں۔ یا

(۷) دشواریوں کا حل تلاش کریں۔

پاکستان کی سابقہ حکومتوں نے راہِ اول اختیار کی تھی یعنی انہوں نے دشواریوں کے سامنے سپر ڈال کر اسلامی مملکت کے قیام کا خیال ہی چھوڑ دیا تھا۔ اور ایک خلاف قرآن آئین پر اسلامی لیبل چپکا کر "ہیرو" بن گئے تھے۔ یہی وہ آئین

یہ جھنجھٹ باروشن فکر ہے کا مطالبہ احتشام الحق صاحب اور ان کے ہمنوا کر رہے ہیں کیونکہ وہ لیبل انہی حضرات کے ہاتھوں سے چسپاں کیا گیا تھا۔ لیکن مملکت پاکستان کے موجودہ صدر جنرل محمد ایوب خاں نے گذشتہ چھ سات ماہ میں مختلف مواقع پر اس باب میں جو کچھ کہا ہے اور جس انداز سے کہا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ہماری موجودہ حکومت سپر اندازی کا خیال نہیں رکھتی۔ دشواریوں کا مقابلہ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ جس جرأت سے انہوں نے سیاسی پارٹیوں کا خاتمہ کیا (اسلامی مملکت میں جن کا وجود مذہبی فرقوں کی طرح یکسر غیر اسلامی ہوتا ہے) اور جس عزم و ہمت سے انہوں نے زرعی اصلاحات کا نفاذ کیا ہے وہ ان کے ارادوں کی پختگی اور عزم کی بلندی کے آئینہ دار ہیں۔ بہر حال سوال اگر صرف دشواریوں کا حل دریافت کرنا ہو تو ہم ان حضرات کو یقین دلاتے ہیں کہ اس کا حل معلوم کر لینا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ معاشرہ کو اسلامی بنا دینا ایک دن کا کام نہیں۔ اس میں کافی وقت لگے گا اور بتدریج منزل تک پہنچا جائے گا۔ لیکن سب سے پہلا کام منزل کا تعین ہے۔ منزل کے تعین کے بعد آئین کا مرتب کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ آئین درحقیقت نام ہے اُس راستے کا جس پر چل کر، یا اُن حدود کا جن کے اندر رہتے ہوئے، مملکت اپنی منزل تک پہنچتی ہے۔ یہ حدود وہ مستقل اقدار ہیں جنہیں قرآن کریم غیر متبدل اصولِ زندگی کے طور پر دیتا ہے۔ ان مستقل اقدار کی روشنی میں اسلامی آئین کا مرتب کر لینا کچھ بھی مشکل نہیں۔ یاد رکھئے قرآن عام طور پر اصولی ہدایات دیتا ہے ان کی جزئیات سے بحث نہیں کرتا۔ یہ اصول غیر متبدل ہیں لیکن ان کے تابع مرتب کردہ جزئیات، زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ باہمی مشاورت سے بدلی جا سکتی ہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن سے اسلامی آئین مرتب نہیں کیا جا سکتا، وہ درحقیقت جزئی قوانین کو قرآن سے تلاش کرتے ہیں۔ یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ قرآن زندگی کے اصول دیتا ہے اور ایسے واضح طریق پر دیتا ہے کہ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) ان کی روشنی میں مملکت کا آئین مرتب کر لینا کچھ مشکل نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہی وہ غلط فہمی تھی جس کی بنا پر محترم وزیر خارجہ نے یہ فرمایا کہ اس باب میں (سابقہ) اسلامک لاء کمیشن بھی ناکام رہا۔ (اخبارات کی رپورٹ کے مطابق) ان کے الفاظ یہ تھے۔

> یہ بھی معلوم ہے کہ موجودہ قوانین کو اسلامی قوانین کے ساتھ مطابقت دینے کے لئے جو کمیشن مقرر ہوا تھا، اس نے اپنے فرائض کو کیسے انجام دیا تھا۔
>
> (پاکستان ٹائمز ۱۱/۳)

اول تو اس کمیشن کا وظیفہ (جیسا کہ محترم وزیر خارجہ نے خود فرمایا ہے) موجودہ قوانین کو اسلامی قوانین کے مطابق مرتب کرنے کی سفارشات کرنا تھا۔ اس کا تعلق آئین سازی سے تھا ہی نہیں۔ اس کا تقرر پاکستان کا آئین منظور ہو جانے کے بعد (اور اس آئین کے تابع) ہوا تھا۔ دوسرے جہاں تک ہمیں معلوم ہے، اس کمیشن کی صرف ایک میٹنگ (جنوری سنہ ۱۹۵۸ء میں) ہوئی تھی جس میں اس کے ابتدائی قواعد و ضوابط سے متعلق بحث ہوئی تھی۔ اس کی دوسری میٹنگ سے قبل مارشل لاء نافذ

ہوگیا اور اس کے بعد اس کی تنسیخ عمل میں آگئی۔ اس لئے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اُس کمیشن نے اپنے فرائض کس طرح سرانجام دیئے تھے۔ لیکن ہم محترم وزیر خارجہ سے متفق ہیں کہ اُس زمانے میں حکومت کی عمومی پالیسی یہی تھی کہ حقیقی اسلام کے متعلق کوئی بات ہو نہیں لیکن اسلام کے نام سے عوام کو خوش کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے مذہبی پیشوائیت کو اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ اس حقیقت سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے کہ مفاد پرست سیاست اپنے مقاصد کو ہمیشہ مذہبی پیشوائیت کے تعاون سے بروئے کار لایا کرتی ہے۔ صاحب ضرب کلیمؑ کے مقابلے کے لئے فرعون خود میدان میں نہیں آتا۔ ہامان کو آگے بڑھایا کرتا ہے۔ قرآن نے آکر یہ اعلان کیا کہ دین میں مذہبی پیشواؤں کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں۔ دین کی عملی تعبیر اس مملکت کے ذریعے ہوتی ہے جو قوانین خداوندی کو نافذ کرنے کے لئے وجود میں آئے۔ جب قوانین خداوندی کی تنفیذ و ترویج کی ذمہ داری حکومت کے سر پر ہو تو مذہبی پیشواؤں کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اس میں ہر متنازعہ فیہ معاملہ کا فیصلہ حکومت کی طرف سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں (جب اسلامی حکومت قائم تھی) مذہبی پیشواؤں کا نشان تک نہیں ملتا۔ اُس دور میں تو نماز کی امامت بھی حکومت کا نمائندہ کرتا تھا۔ اس کے بعد جب مذہب اور سیاست الگ الگ ہو گئے تو مملکت کے فرائض حکومت نے سنبھال لئے اور نکاح طلاق جیسے شخصی قوانین مذہبی علماء کے حصے میں آ گئے یہی ثنویت انگریز کے زمانے میں (ہندوستان میں) قائم رہی اور یہی اب پاکستان میں موجود ہے۔ لیکن اسلامی حکومت میں یہ پوزیشن نہیں ہوگی۔ اس میں مذہبی پیشوائیت (کہ جس کا تصور کتاب و سنت کے خلاف ہے) باقی نہیں رہے گی۔ اس میں قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں قوانین سازی کا فریضہ نمائندگان ملت کے سپرد ہوگا اور ان قوانین کی تنفیذ کا کام حکومت کے سپرد۔ اس میں شخصی اور غیر شخصی قوانین کی بھی کوئی تفریق نہیں ہوگی (عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافت راشدہ میں اس قسم کی کوئی تفریق نہیں ملتی) نہ ہی اس میں انفرادی "فتاویٰ" کا سوال ہوگا۔ شریعت کے ہر معاملے کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور وہیں سے ہر متنازعہ فیہ مسئلہ کا فیصلہ ملے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان امور کے فیصلوں کے لئے قوانین شریعت کی واقفیت ضروری ہوگی لیکن یہ سب کچھ حکومت کی طرف سے ہوگا۔ اُس وقت انفرادی آراء و فتاویٰ کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ حتیٰ کہ اُس وقت "مذہبی دارالعلوموں" اور "کالجوں" کی تفریق بھی ختم ہو جائے گی۔ ایک ہی درسگاہ ہوگی جس میں دین اور دنیا سے متعلق علوم کی تعلیم دی جائے گی۔ اُس وقت کا (C.S.P) افسر عالم دین بھی ہوگا، اور ڈپٹی کمشنر جامع مسجد کا خطیب بھی۔ ان حالات کی روشنی میں آپ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری مذہبی پیشوائیت اس بات کو کبھی گوارا نہیں کر سکتی کہ یہاں اس قسم کی حکومت قائم ہو جائے جس میں ان کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ ان حضرات کی طرف سے صحیح اسلامی حکومت کے قیام کی مخالفت ہوگی اور سخت مخالفت۔ یہ صرف اسی ٹائپ کی حکومت پسند کریں گے جس میں فرقے باقی رہیں فرقوں کے نمائندے باقی رہیں۔ حکومت کا تعلق صرف امور مملکت سے ہو اور مسائل شریعت علماء کی تحویل میں رہیں۔ جس میں حکومت

کے عائد کردہ ٹیکس حکومت کے خزانے میں جائیں اور زکوٰۃ اور اوقاف کا روپیہ علماء حضرات کے زیرِ اختیارات رہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ پاکستان میں اسلامی آئین کی تدوین کی راہ میں دشواری یہ نہیں کہ قرآن کریم سے ایسا آئین مرتب نہیں ہو سکتا۔ اصل دشواری ہماری مذہبی پیشوائیت کا وجود ہے۔ جو اسے گوارا ہی نہیں کر سکتی کہ یہاں (یا کہیں اور) صحیح قرآنی نظام قائم ہو جائے۔ اس لئے کہ اس نظام میں ان کا وجود باقی نہیں رہتا۔ لہٰذا اگر ہم نے یہاں صحیح اسلامی نظام قائم کرنا ہے تو ہمیں اس دشواری کا حل تلاش کرنا ہوگا۔

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ محترم وزیرِ خارجہ نے (صورتِ حالات کا جائزہ لینے کے بعد) کہا کہ
ہمیں ایک نہ ایک دن اس مسئلہ کا جراءت مندانہ انداز سے سامنا کرنا ہوگا۔

(پاکستان ٹائمز ۱۱ ۳/۵۹)

ان کا یہ اعلان بڑا حوصلہ بخش اور ہمت افزا ہے اور ہم اس پر انہیں (اور جس حکومت کے وہ نمائندہ ہیں خود اس حکومت کو) مستحقِ مبارکباد سمجھتے ہیں۔ اس حکومت نے جس وقت (اس مبارک اور مسعود مقصد کے لئے) قدم اٹھایا دیکھیں گے کہ خدا کی توفیق و نصرت کس طرح آگے بڑھ کر اس کا استقبال کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ آئینِ پاکستان سے متعلق مسائل کو انفرادی بحث و نزاع کا موضوع بنایا جائے، حکومت اس مقصد کے لئے ایک کمیشن مقرر کرے جو ان امور کی تحقیق کرے کہ

(۱) اس آئیڈیالوجی کا صاف اور واضح مفہوم کیا ہے جس کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔

(۲) ایک مملکت کس شکل اور کن شرائط کے ماتحت اسلامی مملکت بن سکتی ہے۔

(۳) اسلامی مملکت کے آئین کی بنیاد کس چیز پر ہوتی ہے۔

(۴) اس مملکت کے آئین (قوانین) میں غیر متبدل عناصر کیا ہوتے ہیں اور قابلِ تغیر و تبدل اجزا کون سے۔

(۵) اسلامی مملکت کے قیام کا مقصد اور اس کا منتہیٰ کیا ہوتا ہے۔ اس منتہیٰ تک پہنچنے کے لئے پاکستان کے راستے میں جن دشواریوں کے پیش آنے کا امکان ہے، ان کا اصولی طور پر حل کیا ہے۔

یہ اور اسی قسم کے دیگر بنیادی سوالات، اس کمیشن کے (TERMS OF REFERENCE) ہونے چاہئیں۔ یہ کمیشن ایسے ارکان پر مشتمل ہونا چاہیئے جن کی دینی بصیرت اور علم و فکر پر اعتماد کیا جا سکے اور جو کسی مذہبی فرقہ سے متعلق نہ ہوں۔ آئین سازی کے سوال پر اس کمیشن کی تحقیقات کے نتائج کی روشنی میں غور کرنا چاہیئے اور اس سے پہلے اسے معرضِ بحث میں لانا ہی نہیں چاہیئے۔ ہمیں امید ہے کہ اگر اس کمیشن کے ارکان کا انتخاب صحیح طور پر ہو گیا اور اس نے اپنے فریضہ کو زندگی کا مقصد سمجھ کر سرانجام دیا تو اس سے ایسے خوشگوار نتائج پیدا ہوں گے جن کی

نظیر کہیں نہیں ملے گی۔ ہماری تاریخ میں اس قسم کی تحقیقات کا یہ پہلا موقع ہے اور اگر حکومت اس میں کامیاب ہو گئی تو اس کا یہ کارنامہ جریدۂ عالم پر اس کا دوام ثبت کر دے گا اور یہ صرف اہل پاکستان پر ہی نہیں بلکہ پوری کی پوری ملتِ اسلامیہ پر احسانِ عظیم ہو گا۔

اس کے ساتھ ہی حکومت کو یہ بھی سوچنا ہوگا کہ ہمارے موجودہ مذہبی پیشواؤں کی معاش کا خاطر خواہ اور باعزت انتظام کیا ہو سکتا ہے۔ انہیں کوئی ہنر ایسا نہیں آتا جس سے یہ روٹی کمانے کے قابل ہو سکیں۔ یہ ان کا قصور نہیں اُس غلط نہج تعلیم کا نقص ہے جو ہمارے مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں میں ملتی ہے۔ اس تعلیم کی رو سے نہ تو دین کی حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ ہی انسان کسبِ معاش کے قابل رہتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان حضرات کے معاش کا انتظام کیا جائے۔ اور آئندہ کے لئے ان مکاتب اور دارالعلوموں کا سلسلہ ختم کر کے دینی اور دنیاوی تعلیم کو یکجا کر دیا جائے۔

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ ہمارے مذہبی مدرسوں اور دارالعلوموں میں جو تعلیم ملتی ہے اس سے دین کی حقیقت بھی سمجھ میں نہیں آسکتی تو یہ ایک امر واقعی کا اظہار ہے۔ یہ واقعہ ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ دین کی حقیقت سمجھنے کے لئے قرآن کریم کی تعلیم نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر دین سمجھ میں نہیں آسکتا ہے۔ لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے حیرت ہو گی کہ درس نظامی میں جس کی تعلیم ہمارے مدارس میں دی جاتی ہے قرآن کریم نصاب میں داخل نہیں ہوتا۔ صرف سورۂ بقرہ تبرکاً پڑھا دی جاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ قرآن مجید کی ان حضرات کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ کتاب مبہم ہے۔ اس کی بات صاف طور پر سمجھ میں نہیں آسکتی۔ یہ مجمل ہے۔ جب تک اس میں خارجی اضافے نہ کئے جائیں اس کا کوئی بیان مکمل نہیں ہوتا۔ اس میں اختلافات پائے جاتے ہیں جنہیں مٹانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس کی بعض آیات کو منسوخ سمجھا جائے۔ اس کی آیات کی تنسیخ خود اس کی دوسری آیات سے بھی ہوتی ہے اور احادیث سے بھی۔ اس کے الفاظ تک میں بھی اختلاف ہے اور اس کا ان کے عقیدہ کی رو سے ثبوت یہ ہے کہ مختلف جلیل القدر صحابہؓ کے پاس قرآن کے جو نسخے تھے وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے[1]۔ یہ ہے ان حضرات کا عقیدہ قرآن کے متعلق۔ قرآن کو چھوڑ کر ان مکاتب میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ دین سے متعلق نہیں ہوتا بلکہ اُس فرقے سے متعلق ہوتا ہے جس فرقہ کا وہ مدرسہ یا دارالعلوم ہو۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ایک فرقہ اپنے آپ کو صرف اسی صورت میں حق و صداقت پر مبنی ثابت کر سکتا ہے جب وہ دوسرے فرقوں کے متعلق یہ ثابت کر دے کہ وہ حق پر نہیں باطل پر ہیں۔ چنانچہ ان مدارس میں تمام بحثیں اپنے آپ کو حق پر اور دوسرے فرقوں کو باطل پر ثابت کرنے کے لئے وقف ہوتی ہیں۔ ہمارے ان ارباب مذہب نے جنہوں نے محترم وزیر خارجہ کے بیانات پر تنقید کی ہے یہ بھی کہا ہے کہ مختلف فرقوں کا اختلاف محض فروعی ہے۔ اصولی طور پر یہ سب آپس میں متحد و متفق ہیں۔ ہمیں

---

[1] اس کے متعلق ایک مقالہ اسی اشاعت میں الگ شائع ہو رہا ہے۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کا یہ بیان حقیقت کے یکسر خلاف ہے۔ فرقوں کے باہمی اختلافات کا یہ عالم ہے کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو مسلمان ہی نہیں سمجھتا۔ اس ضمن میں پرانی بحثوں کو تو چھوڑیئے ابھی ابھی ہمارے سامنے ایک رسالہ آیا ہے جو اپنے آپ کو "قرآن وسنت کا ترجمان" کہتا ہے اور جو "شیخ القرآن" مولانا غلام اللہ خاں صاحب کی زیرِ سرپرستی راولپنڈی سے شائع ہوتا ہے۔ اس میں "وہابی" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ جس کا پہلا فقرہ یہ ہے

> وہابی ایک فرقہ ہے جس کو غلطی سے مسلمان سمجھا جاتا ہے۔ آجکل یہ فرقہ رضاخانی بریلوی کے نام سے مشہور ہے
>
> (تعلیم القرآن۔ بابت مارچ سنہ ۱۹۵۹ء صفحہ ۲۵)

یہ ہے دین کی وہ تعلیم جو ہمارے ان مذہبی دارالعلوموں میں دی جاتی ہے۔ باقی رہی عصرِ حاضر کے علوم کی تعلیم سو اس کا ان کے ہاں ذکر ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اگلے دنوں انجمن حمایت الاسلام لاہور کے جلسہ میں ایک دارالعلوم کے قیام کی تجویز پیش ہوئی تو صدرِ پاکستان محترم جنرل محمد ایوب خاں نے فرمایا کہ

> اسلام اور اس کے مختلف شعبہ ہائے علم کا مطالعہ وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ اس وقت تک ہمارے ملک میں اسلام سیاسی مصلحتوں کا شکار رہا ہے۔ کچھ لوگ اسے روزی کمانے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو مذہب کی اصل روح کو عملی زندگی کے قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب ایک ایسے ادارے کی ضرورت ہے جو نئے علوم اور سائنٹفک ترقی کی روشنی میں اسلام کی حقیقی روح کو ظاہر کر سکے۔　　(پاکستان ٹائمز۔ ۳/۵۹ ۵)

اس ضمن میں ہم پھر عرض کریں گے کہ اس مقصد کے لئے کسی الگ ادارے (دارالعلوم) کی ضرورت نہیں۔ یہ مقصد اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ ہماری دنیاوی درسگاہوں (اسکولوں اور کالجوں) میں صحیح دینی تعلیم دی جائے اور جداگانہ مذہبی مدرسوں اور دارالعلوموں کو ختم کر دیا جائے۔ اس ضمن میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے فقہ کے مسائل کا جاننا ضروری ہے اور ہمارے جداگانہ مذہبی مدارس اس ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہتے وقت اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں فقہ کے مسائل بنے بنائے نہیں رکھے رہتے جن کے علم کے بغیر شریعت کے مطابق زندگی بسر نہ کی جا سکے۔ اسلامی مملکت دین کے غیر متبدل قوانین کی روشنی میں اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود مسائل (یعنی جزئی قوانین وضوابط) مرتب کرتی اور انہیں حکومت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ کرتی ہے۔ انہی کا نام فقہ کے مسائل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حکومت کے قوانین کی تعلیم کے لئے جداگانہ مذہبی دارالعلوموں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ مذہبی مدرسے اور دارالعلوم ایسے افراد پیدا کرتے ہیں (اور ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے) جو امت میں مستقل تفرقہ انگیزی کا موجب بنتے ہیں کیونکہ یہ کسی نہ کسی فرقے سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور ملک کے معاشی نظام پر ایک بوجھ بنے رہتے ہیں کیونکہ انہیں ایسی تعلیم دی نہیں جاتی جس سے یہ اپنی روٹی آپ کمانے کے قابل بن سکیں۔ چہ جائیکہ یہ ملک کی پیداوار بڑھانے کے سلسلے میں مفید ہو سکیں۔ اس لئے ان درسگاہوں کا الگ وجود ملک، ملت اور اسلام سب کے لئے مضر ہے۔ لہٰذا اس

مرض کا علاج یہی ہے کہ موجودہ مذہبی پیشواؤں کی باعزت روزی کا انتظام حکومت کی طرف سے کیا جائے اور الگ مذہبی مکاتب وغیرہ کو بند کر کے صحیح دینی تعلیم اسکولوں اور کالجوں میں دی جائے۔

جو کچھ ہم نے سابقہ صفحات میں پیش کیا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ

(۱) پاکستان کے لئے اسلامی آئین کا مرتب کر لینا کچھ مشکل نہیں بشرطیکہ اس مسئلہ کو صحیح خطوط پر سمجھا جائے اور اسکے لئے صحیح راستے پر اقدامات کئے جائیں۔

(۲) اسکے متعلق یہ خیال دل سے نکال دیا جائے کہ (اسلامی آئین) ہمارے مذہبی پیشوا مرتب کریں گے یا اس کی ترتیب و تدوین میں ان کا عمل دخل ناگزیر ہے۔ اگر ہم نے ایسا سمجھ لیا تو اسلامی آئین قیامت تک بھی مرتب نہیں ہو سکے گا۔

(۳) اسلامی آئین قرآن کے غیر متبدل قوانین مستقل اقدار کے مطابق مملکت کا منتہی و مقصود متعین کرے گا اور اس کے حصول کے لئے حدود و شرائط کی نشاندہی کرے گا۔ ان حدود و شرائط کے اندر رہتے ہوئے عملی اقدامات ملت کے باہمی مشورے سے طے ہوں گے۔

(۴) اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو پاکستان کی آئیڈیالوجی اور اسلامی مملکت کے اصول و مبانی کے متعلق فرقہ دارانہ اثرات سے بلند ہو کر تحقیق کرے اور اسکی سفارشات کی روشنی میں آگے قدم اٹھایا جائے۔

(۵) ملک سے مذہبی فرقہ دارانہ تعلیم کو ختم کر کے امتِ واحدہ کی تشکیل مملکت کا فریضہ قرار پائے۔ اور اس منتہیٰ تک بتدریج پہنچا جائے۔ اس کا مؤثر اور کامیاب طریق یہ ہے کہ ہم اپنے نظامِ تعلیم میں بنیادی تبدیلی پیدا کریں۔ جداگانہ مذہبی مدارس اور دارالعلوموں کو ختم کر کے صحیح دینی تعلیم مدرسوں اور کالجوں میں دی جائے اور اسکی بنیاد قرآن کریم اور اسکی روشنی میں اسوۂ حسنہ نبی اکرمؐ کو قرار دیا جائے۔

(۶) ہمارے موجودہ اربابِ مذہب کی روزی کا باعزت اور معقول انتظام کیا جائے۔ اور انھیں اس قسم کے خیالات کے نشر و اشاعت کی اجازت قطعاً نہ دی جائے جن سے فرقہ دارانہ کشیدگی بڑھے اور مذہبی گروہ بندی کی گرہیں مضبوط ہوتی جائیں۔

کیا ہم توقع کریں کہ ہمارے اربابِ بست و کشاد ہماری ان معروضات کو درخورِ اعتنا تصور فرمائیں گے؟

اگلا شمارہ کونشن سے متعلق ہوگا جس میں اجتماع کی روئداد بھی شامل ہوگی اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس پرچے کی اشاعت میں کچھ تاخیر ہو جائے۔ قارئین اسے ذہن میں رکھیں۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

تعلیمی کمیشن کے سوالنامے کا جواب

مرکزی حکومت کی طرف سے جو تعلیمی کمیشن مقرر ہوا ہے۔ اس پر عمومی تبصرہ طلوع اسلام کی سابقہ اشاعتوں میں قارئین کے سامنے آچکا ہے۔ کمیشن نے اپنی تحقیقات کے سلسلہ میں ایک طول طویل سوالنامہ (انگریزی میں) شائع کیا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ تعلیم کے نظم و نسق اور فنی گوشوں سے متعلق ہے جن کی ہمارے نقطۂ نگاہ سے چنداں اہمیت نہیں۔ البتہ بعض سوالات ایسے ہیں جو عام توجہ کے مستحق ہیں۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے ان سوالات کے جو جوابات کمیشن کو بھیجے گئے ہیں ان کا اردو ترجمہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ اس مقام پر ہم اس حقیقت کو پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ تعلیم کی اہمیت اور اس کی اساس اور بنیاد کے متعلق طلوع اسلام کے خیالات سے قارئین بخوبی واقف ہیں۔ انہیں ہم نے تعلیمی کمیشن کے صدر کی خدمت میں الگ بھیجا دیا ہے۔ یہ جوابات کمیشن کے سوالنامے کے بعض اہم حصوں سے متعلق ہیں۔

۱۔ سوال:۔ کیا مردوں سے الگ عورتوں کی تعلیم خصوصی توجہ کی مستحق ہے؟ اگر اس کا جواب مثبت میں ہے تو اس کی وجہ بیان کیجئے۔ اور یہ بھی بتلائیے کہ یہ کس ضمن میں خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔

جواب:۔ جی ہاں۔ عورتوں کی تعلیم خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔ ان کے وظائف زندگی مردوں سے مختلف ہیں ان کا دائرۂ سعی و عمل بیشتر گھر سے متعلق ہے اور مردوں کا بیشتر امور بیرون خانہ سے۔

۲۔ سوال:۔ قومی اور ثقافتی نشوونما کے سلسلہ میں عورتوں کی خاص ذمہ داریاں کیا ہیں؟

جواب:۔ قوم کے لئے عربی زبان میں اُمت کا لفظ استعمال ہوتا ہے جو اُم سے مشتق ہے۔ اور اُم کے معنی ہیں ماں۔ قوم کی تشکیل و تعمیر آغوشِ مادر میں ہوتی ہے ــــ جسمانی اعتبار سے بھی اور ذہنی اور ثقافتی نقطۂ نگاہ سے بھی۔ اس میدان میں عورتوں کی ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں۔

۳۔ سوال:۔ آپ کے نزدیک اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم میں "گھریلو معاشیات (HOME ECONOMICS) کا کیا مقام ہونا چاہیئے؟

جواب:۔ اسکولوں میں تو اس مضمون کی تدریس صرف اس حد تک ہونی چاہیئے جس سے یہ تعلیم پر عمومی اثر ڈال

سکے لیکن کالج میں اس مضمون کو مکمل طور پر پڑھایا جانا چاہیئے۔

(۴) سوال:۔ کیا آپ کے نزدیک یہ مناسب اور ضروری ہے کہ ابتدائی (پرائمری) درجہ تک کے بچوں کی تعلیم تمام تر استانیوں (WOMEN TEACHERS) کے سپرد ہو۔

(ب) جو استانیاں دیہاتی مدارس میں متعین کی جائیں، ان کے لئے کون کون سی خصوصی مراعات ضروری ہیں۔

جواب:۔ یہ مناسب اور ضروری ہے کہ ابتدائی جماعتوں کے بچوں کی تعلیم خالصتہً استانیوں کے سپرد ہو۔ لیکن یہ استانیاں کم عمر کی لڑکیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ بڑی عمر کی عورتیں ہونی چاہئیں ـــــ بالخصوص بیوائیں یا بے اولاد، پختہ سن عورتیں جن کے پاس سامانِ زیست کی کمی ہو۔ دیہاتی مدارس کے لئے استانیاں حتی الامکان دیہات ہی کی ہونی چاہئیں شہری نہیں۔ وہ دیہاتی ذہنیت اور احوال و ظروف سے بخوبی واقف ہوں گی اور اپنے فارغ اوقات میں مقامی عورتوں میں گھل مل کر رہ سکنے کے قابل۔ تعلیم و تدریس کے علاوہ، انہیں ابتدائی طبی امداد اور عام بیماریوں کے علاج معالجے سے بھی واقفیت ہونی چاہیئے۔ ان کی جملہ ضروریات کی ذمہ داری حکومت کے سر پر ہونی چاہیئے۔ علاوہ ازیں میلی نگاہوں والے عناصر سے ان کی حفاظت کا پورا پورا انتظام ہونا چاہیئے۔

(۵) مختلف سوالات میں یہ دریافت کیا گیا کہ اسکولوں اور کالجوں میں "اسلامیات" کا مقام۔ نوعیت اور دائرۂ تحقیق و تدریس کیا ہونا چاہیئے۔ ان سوالات کا جامع جواب حسب ذیل دیا گیا۔

جواب۔ یونیورسٹی میں قرآن مجید کی وسیع اور گہری تعلیم دی جانی چاہیئے۔ طلباء کو بتانا چاہیئے کہ اس ضابطۂ حیات کی رُو سے زندگی کا منتہیٰ کیا ہے اور اس منتہیٰ کے حصول کا طریقہ کیا۔ یعنی ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل جو تمام نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار ہو۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کی اور اسلامی فکر کی تاریخ بھی پڑھانی چاہیئے۔ اس کا مطالعہ علم و بصیرت کی روشنی میں کرانا چاہیئے اور تنقید کا مدار خالصتہً قرآن کو قرار دینا چاہیئے۔ یعنی انہیں بتانا چاہیئے کہ ہماری تاریخ میں جو کچھ قرآن کے مطابق ہے وہ حق اور صداقت کے مطابق ہے جو قرآن کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔

اسلامیات کی تعلیم اس انداز کی ہونی چاہیئے جس سے گورنمنٹ اسکولوں اور دینی دارالعلوموں کی ثنویت (DUALISM) ختم ہو جائے۔ ایک اسلامی حکومت میں اس امر کا تصور ہی تعجب انگیز ہے کہ دینی تعلیم کے لئے الگ مدارس ہوں اور دنیاوی تعلیم کے جداگانہ اسکول۔ یہ تفریق غیر مسلم حکمرانوں کے دور کی یادگار ہے جو اب یہاں سے جا چکے ہیں۔

ہمارے بچوں کی تعلیم خواہ وہ عمومی ہو خواہ فنی (TECHNICAL) اس میں قرآن کریم کے عالمگیر غیر متبدل قوانینِ حیات کی حیثیت بنیادی ہونی چاہیئے ـــــ وہ اصول جو تکریم و حرمتِ آدمیت۔ فرد کی ذات کی نشوونما، عالمگیر انسانیت کی ربوبیت وغیرہ کا سبق دیتے ہیں۔

(۶) متعدد سوالات، اساتذہ کے مشاہرہ حقوق و فرائض اور ذمہ داریوں سے متعلق تھے۔ ان کا جامع جواب حسب

ذیل دیا گیا۔

جواب۔ اساتذہ کی ملازمت کو، ملک کی باقی تمام ملازمتوں کے مقابلہ میں زیادہ جاذب بنانا چاہیئے تاکہ قوم کے بہترین دل و دماغ سب سے پہلے اس شعبہ کی طرف کھنچ کر آئیں۔ اساتذہ کا مشاہرہ ان کی ضروریاتِ زندگی کے مطابق مقرر ہونا چاہیئے یعنی استاد کی اپنی اور اس کے افرادِ خاندان کی ضروریاتِ زندگی، ایک معزز شہری کے درجہ کے مطابق، بہم پہنچانی چاہئیں۔ اسے اس امر کا اطمینان اور یقین ہونا چاہیئے کہ اسے زمانۂ ملازمت میں اور اس کے بعد (تاحینِ حیات) اپنی اور اپنے افرادِ خاندان کی ضروریاتِ زندگی کے لئے کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی۔ جب وہ طبعی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے اس طرح مطمئن ہو جائے گا تو اسے اپنی ذات کی نشوونما کی طرف توجہ دینے کی فرصت نصیب ہوگی۔ وہ اپنے اندر سیرت و کردار کی پختگی اور بلندی پیدا کر سکے گا۔ اور اس طرح اپنے شاگردوں کے لئے ضبطِ نفس، بلندیٔ سیرت اور حسنِ ذات کا نمونہ بن سکے گا۔

(۷) سوال۔ ذریعۂ تعلیم کونسی زبان ہونی چاہیئے۔

جواب:۔ ابتدائی جماعتوں میں ذریعۂ تعلیم مقامی زبان میں ہونی چاہیئے۔ ثانوی مدارج میں اردو۔ لیکن جن طلباء نے یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنی ہو ان کے لئے ثانوی درجہ ہی میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو جانا چاہیئے۔ اور اردو کی حیثیت ثانوی رہ جانی چاہیئے۔ یونیورسٹی میں ذریعۂ تعلیم انگریزی ہونا چاہیئے۔ (اس ضمن میں آخری نوٹ ملاحظہ فرمایئے)

(۸) سوال:۔ وہ کون سے اقدامات کئے جائیں جن سے والدین اپنے بچوں کی تعلیم اور مدارس کی فلاح و بہبود کے ضمن میں زیادہ دلچسپی لیں۔

جواب۔ بچوں کے والدین سے یہ توقع ہی نہیں رکھنی چاہیئے کہ وہ ان کی تعلیم کے مسئلہ میں دلچسپی لے سکیں گے۔ ان بیچاروں کا سارا وقت کسبِ معاش کی نذر ہو جاتا ہے۔ انھیں فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ بچوں کی تعلیم کی بھی دیکھ بھال کر سکیں۔

قوم کے بچے مملکت کی اپنی اولاد ہوتی ہے۔ جب ان کی تعلیم کی ذمہ داری مملکت لے لے گی تو پھر اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا کہ ان کے والدین ان کی تعلیم کے مسئلہ میں کس قدر دلچسپی لیتے ہیں۔ ان کے "والدین" خود اسلامی مملکت بن جائے گی۔

(۹) سوال۔ ثانوی مدارس میں مضامین کیا ہونے چاہئیں۔

جواب۔ (باقی مضامین کے متعلق ضرورت کے لحاظ سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے لیکن) قرآن کریم کی تعلیم شروع سے آخر تک بچے کی ذہنی سطح کے مطابق، مسلسل دینی چاہیئے۔ اس سے وہ نسل پیدا ہوگی جو اپنے قلب کی گہرائیوں میں اس آئیڈیلوجی کو لے کر ابھرے گی جس کے لئے پاکستان کا خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا۔

(۱۰) سوال:۔ اسکولوں میں صنعتی تعلیم کا مقام کونسا ہونا چاہیئے؟

جواب:۔ ہر طالب العلم کے لئے ایسے مواقع بہم پہنچانے چاہئیں کہ وہ جس صنعتی فن کی طرف طبیعت کا میلان دیکھے اس کی مشق کرنے لگ جائے۔

(۱۱) سوال:۔ اقامتی اسکولوں (RESIDENTIAL SCHOOLS) کی اہمیت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اس مقصد کے سلسلہ میں کیا اقدامات کئے جانے چاہئیں کہ جو بچے اعلیٰ قابلیت رکھتے ہوں لیکن ان کے مالی ذرائع اچھے نہ ہوں تو وہ بھی ان اسکولوں میں داخل ہو سکیں۔

جواب:۔ تعلیم کا مقصد قلب و دماغ کی تعمیر ہے۔ محض معلومات کی فراہمی نہیں۔ اس قسم کی تعلیم بچے کی جزوی زندگی سے ممکن نہیں۔ اس لئے اقامتی درسگاہوں کی اہمیت واضح ہے۔

باقی رہا اخراجات کا سوال۔ سو جب بچوں کی تعلیم مملکت کی ذمہ داری قرار پائے گی تو انفرادی اخراجات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ مملکت کی ذمہ داری میں ہر بچہ وہ کچھ بن سکے گا جو کچھ بننے کی صلاحیت اس میں ہے۔ کسی کی مضمر صلاحیتیں اخراجات کی کمی یا فقدان کی وجہ سے دبی کی دبی نہیں رہ جائیں گی۔ صلاحیت کی نشوونما اس صورت میں دب کر رہ جاتی ہے جب ہر بچے کے ماں باپ کو اس کی تعلیم کا کفیل ٹھہرا دیا جائے۔ (اس صورت میں صرف امیروں کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتے ہیں خواہ وہ دماغی طور پر کتنے ہی نالائق کیوں نہ ہوں۔ اور غریبوں کے بچے اعلیٰ تعلیم کے لئے ترستے رہ جاتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی قابل کیوں نہ ہوں)۔ لیکن جب پوری کی پوری نسل کی تعلیم کی ذمہ دار اسلامی مملکت ہو جائے گی تو پھر ہر بچہ تعلیم کی اس آخری منزل تک پہنچ سکے گا جس تک پہنچنے کی اس میں صلاحیت ہوگی۔

(۱۲) سوال۔ جو لوگ دن میں ملازمت کرتے ہوں کیا ان کی تعلیم کے لئے شبینہ جماعتوں کا انتظام کیا جائے۔

جواب:۔ جو لوگ دن بھر ملازمت کرتے ہیں وہ عام طور پر اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لئے مزید تعلیم حاصل کرتے ہیں یعنی تعلیم سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اور اپنے متوسلین کی ضروریات زندگی کے حصول زیادہ پیسہ جمع کرنے کے لئے زیادہ کما سکیں۔ اس تعلیم کا جذبہ محرکہ اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوتا ــــ اور اس میں کوئی شبہ ہی نہیں کہ انسانی ذات کی نشوونما کا خیال اس کا جذبہ محرکہ قطعاً نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کے لئے تعلیمی مواقع بہم پہنچانے کے بجائے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ انہیں اس قدر دیا جائے جس سے ان کی ضروریات زندگی پوری ہو جائیں اور وہ ان کی خاطر اس طرح پریشان نہ ہوتے پھریں۔ باقی رہا ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما سو اس کے لئے ایسے مواقع بہم پہنچانے چاہئیں جن میں وہ اپنے مضمر جوہروں کا مظاہرہ کر سکیں۔

(۱۳) سوال۔ اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ حکومت کے ذرائع محدود ہیں اور تعلیم کا دائرہ بہت وسیع۔ مختلف مدارج میں حکومت کی طرف سے اس شعبہ میں کس حد تک مالی امداد ہونی چاہیئے۔

جواب۔ تعلیم کی پوری ذمہ داری مملکت کے سر ہونی چاہیئے۔ (اس میں اخراجات کی تفریق و تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہونا چاہیئے)۔ اگر قوم کی تعلیم صحیح خطوط کے مطابق ہو جائے تو اس سے نظم و نسق اور قوانین و ضوابط سے متعلق شعبوں کے اخراجات خود بخود کم ہو جائیں گے۔ حکومت کے میزانیہ میں سب سے پہلا حق تعلیم کا ہونا چاہیئے۔

(۱۴) سوال۔ اپنی قوم کے مزاج، تصورات اور ذرائع کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کے نزدیک کس قسم کے کھیلوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔

جواب۔ کھیلوں کا انتخاب حسب ذیل مقاصد کی روشنی میں کرنا چاہیئے۔

(۱) جسمانی تندرستی۔ سب سے مقدم

(۲) ٹیم کے اراکین میں تعاون و تناصر کے جذبہ کی بیداری

(۳) ٹینس اور کرکٹ کی قسم کے کھیل دولت مند اقوام کی "عیاشی" ہیں۔ ہمیں انہی کھیلوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے جن سے مذکورہ صدر مقاصد کم از کم خرچ سے حاصل ہو سکیں۔

(۴) نیز ایسے کھیلوں کی بھی ترویج کرنی چاہیئے جن سے انسان اسلحہ کے بغیر بھی دشمن کے مقابلہ میں اپنی حفاظت کر سکے۔ مثلاً لکڑی۔ بوٹ وغیرہ۔

(۵) کھیلوں کا انداز ایسا ہونا چاہیئے جس سے نوجوانوں میں سپاہیانہ خصائل و عادات کی نمود ہو۔ تاکہ وہ عند الضرورت قوم کی مدافعانہ عسکریت (DEFENCE FORCES) کے مفید کل پرزے بن سکیں۔

(۱۵) سوال۔ تعلیمی درسگاہوں میں حفظان صحت کے انتظامات کس انداز میں ہونے چاہئیں۔

جواب۔ ہر طالب العلم کے لئے طبی معائنہ اور علاج بلا قیمت مہیا ہونا چاہیئے۔ یہ بھی مملکت کی ذمہ داری ہے۔

(۱۶) سوال۔ کیا آپ پاکستان میں رومن رسم الخط کے حق میں ہیں۔

جواب۔ عربی رسم الخط کے علاوہ کوئی اور رسم الخط ہمیں قرآن اور اس تصور حیات سے دور لے جائے گا جس کے لئے پاکستان وجود میں آیا ہے۔

نوٹ:۔ ذریعہ تعلیم (زبان) کے سلسلہ میں ہم نے جو جواب دیا ہے وہ ذرا وضاحت طلب ہے۔ ہم نے کہا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم ابتدا سے انتہا تک مسلسل جاری رہنی چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے عربی زبان کی تعلیم ضروری ہوگی۔ کیونکہ عربی زبان جانے بغیر قرآن کریم کی تعلیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جہاں تک علوم حاضرہ کے ذریعہ تعلیم کا تعلق ہے، انگریزی زبان اس قدر بین الاقوامی حیثیت، وسعت اور اہمیت حاصل کر چکی ہے کہ اس کی طرف سے صرف نظر کر لینا یا اسے وہ اہمیت نہ دینا جس کے مستحق زمانے کے تقاضے ہیں اپنے آپ کو

باقی دنیا سے منقطع (CUT OFF) کر لینے کے مترادف ہوگا۔ اس لئے ہمارے نزدیک اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ یہی زبان رہنی چاہیئے۔ سوال یہ نہیں کہ اردو زبان میں اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بننے کی صلاحیت ہے یا نہیں۔ (اگر اسے ذریعۂ تعلیم بنانا مقصود ہو تو اس میں ایسی صلاحیت پیدا کی جا سکتی ہے) اصل سوال یہ ہے کہ وہ کونسی زبان ہے جو اقوام عالم میں ہمارے لئے ذریعہ اظہار خیالات بن سکتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وہ انگریزی زبان ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک بحالاتِ موجودہ اس زبان کی اہمیت کو کم کر دینا ہمارے لئے بڑا مضرت رساں ہوگا۔ اس وقت صرف ان مختصر سے اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ عند الضرورت اس مسئلہ پر تفصیلی طور پر بھی لکھا جا سکتا ہے۔ یہ بہرحال ہمارا ذاتی خیال ہے جو مصالح وقت پر مبنی ہے۔ یہ قرآن کا فیصلہ نہیں جو کسی حالت میں بھی بدلا نہیں جا سکتا۔

اسلام میں

قانون سازی

کا اصول

اس میں پاکستان کے علاوہ بعض دیگر ممالکِ اسلامیہ کے بلند پایہ مقننین کے افکار کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ ایک اسلامی مملکت میں قانون شریعت کا کام کس نہج پر ہونا چاہیئے۔
یہ کتاب وقت کی اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ آپ اپنا نسخہ فوراً منگائیے۔

قیمت فی جلد ۱- دو روپے آٹھ آنے

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔بی۔ گلبرگ۔ لاہور

طلاق کے متعلق ایک نہایت مستحسن فیصلہ

قرآن کریم نے جہاں زندگی کے اور گوشوں میں نہایت خوشگوار انقلاب پیدا کیا وہاں عائلی زندگی کے متعلق بھی ایسے احکام اور اصول عطا کئے جن سے گھر کی زندگی جنت کا نمونہ بن جائے۔ اس نے نکاح کو بالغ مرد اور عورت کی بطیب خاطر رضامندی کا معاہدہ قرار دیا اور اسکے ساتھ ہی یہ بھی کہدیا کہ اگر دسوء اتفاق سے حالات ایسے پیدا ہو جائیں جن میں میاں بیوی کے نباہ کی کوئی صورت باقی نہ رہے تو یہ معاہدہ فسخ بھی ہو سکتا ہے۔

جب مسلمانوں کے خیالات غیر اسلامی تصورات سے متاثر ہو گئے تو اسلامی قوانین میں عجیب عجیب قسم کی تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔ انہی میں ایک یہ بھی تھی کہ مرد کو تو اس کے کلی اختیارات دیدیئے گئے کہ وہ جب جی چاہے عورت کو طلاق دے سکتا ہے لیکن عورت سے اس کا یہ حق سلب کر لیا گیا۔ اس خلاف قرآن تبدیلی سے عورت پر جو مظالم ہونے شروع ہوئے ان کے تذکرہ کی ضرورت نہیں۔

طلوع اسلام کا مقصد زندگی یہ ہے کہ قست میں قرآنی قوانین کی دوبارہ ترویج ہو جائے۔ اس سلسلہ میں وہ نکاح اور طلاق سے متعلق قرآنی احکام کو وضاحت سے بیان کرتا اور قوم کی توجہ اس طرف منعطف کراتا چلا آ رہا ہے کہ وہ غیر قرآنی قوانین کی جگہ قرآنی قوانین کی پابندی اختیار کرے۔ اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ پچھلے دنوں مغربی پاکستان کے ہائیکورٹ میں ایک مقدمہ زیر سماعت آیا جس میں متنازعہ فیہ یہ تھا کہ کیا اسلامی قوانین کی رُو سے عورت کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ شوہر کی رضامندی کے بغیر طلاق حاصل کرنے کیلئے عدالت کیطرف رجوع کر سکے؟ ہمیں یہ معلوم کر کے بیحد خوشی ہوئی کہ ہائیکورٹ کے پورے بنچ نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ عورت کو اس کا حق حاصل ہے بشرطیکہ وہ مہر وغیرہ واپس کر دے۔ (مقدمہ ملقبیس فاطمہ بنام نجم الاکرام۔ بحوالہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۱۰ ۳/۵۹ ص ۳)

یہ فیصلہ قرآنی احکام کے مطابق ہے جسکے لئے ہم مغربی پاکستان کے ہائیکورٹ کو سچی ہزار تبریک و تہنیت قرار دیتے ہیں۔ خدا کرے کہ ہماری مملکت میں جلد از جلد اسلامی آئین نافذ ہو جائے جسکی رو سے جملہ قوانین کو قرآن کریم کے مطابق مدون کیا جائے تاکہ ہماری زندگی پھر سے اسلامی زندگی اور ہمارا معاشرہ ایک بار پھر جنتی معاشرہ بن جائے۔

قرآن نے کہا تھا کہ دنیا میرے متعین کردہ قوانین سے لاکھ سرکشی برتے زمانے کے تقاضے اسے مجبور کر دینگے کہ وہ بالآخر انہی قوانین کو اختیار کرے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا فی الواقعہ رفتہ رفتہ انہی قوانین کی طرف آ رہی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں یہ خبر موصول ہوئی ہے کہ انگلستان میں طلاق کے متعلق ایک مسودہ قانون زیر غور ہے جس کی رُو سے وہ اپنے موجودہ قانون میں ایسی تبدیلیاں کرنا چاہتے ہیں جو قرآنی احکام سے زیادہ قریب ہیں۔ (سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۴ ۲/۵۹)

خدا کرے مسلمان بھی قرآن کے قریب آنے کی کوشش کرے۔

یتیم پوتے اور زرعی اصلاحات

(صدر زرعی کمیشن کی خدمت میں ایک درخواست)

زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں حکومت کی طرف سے جو احکام صادر ہوئے ہیں ان میں ایک شق یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی جدی زمین پر قابض ہے جس میں سے قانون شریعت کی رُو سے دیگر ورثاء کو بھی حصہ ملنا چاہیئے تھا لیکن وہ اس سے رواج کے مطابق محروم رہ گئے تھے، تو موجودہ مالک، ان ورثاء کو زمین سے حصہ دے سکتا ہے۔ یہ شق نہایت معقول اور تقاضائے شریعت کے مطابق ہے لیکن حکومت نے اسے صرف عورتوں اور لڑکیوں (FEMALE DEPENDANTS) تک محدود کر دیا ہے۔ حالانکہ ان بدقسمت محروم الارث ورثاء میں لڑکے اور مرد بھی شامل ہیں۔ بالخصوص یتیم پوتے۔ اس سلسلہ میں ہمارے علم میں ایسے ایسے درد انگیز واقعات آئے ہیں جن کے سننے سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ (مثلاً) ایک بیوہ خاتون نے بتایا کہ اس کا خسر ہزار ہا ایکڑ اراضی کا مالک تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کی (یعنی اس بیوہ کے خاوند) کی شادی بڑی دھوم سے کی۔ بہو بڑے چاؤ سے گھر میں آئی۔ اللہ نے بچے دیئے۔ زندگی امیرانہ ٹھاٹھ سے گذر رہی تھی کہ اچانک اس کے خاوند کا انتقال ہو گیا اور بچوں کے چچا نے اسے اور اس کے بچوں کو اس طرح گھر سے نکال دیا کہ وہ نانِ شبینہ تک سے محتاج ہو گئے۔ اس نے کہا کہ اس جیسی دو اور بیوائیں بھی اس گھر سے اسی طرح نکالی گئیں اور ان کے بچے بھی دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اور تمام اراضی کا مالک اس کا ایک دیور بن چکا ہے محض اس لئے کہ اس کے بھائی اپنے والد کی زندگی میں فوت ہو چکے تھے۔

قرآن کی رُو سے، یتیم پوتے اپنے مرحوم دادا کی جائداد سے محروم نہیں کئے جا سکتے۔ لیکن ہمارا مروجہ قانون ان بدقسمتوں کو محروم قرار دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب حکومت نے اراضیات کے سلسلہ میں اتنا اہم اقدام کیا ہے جس کا رُخ قرآنی منزل کی طرف ہے تو اس کے نافذ کردہ قوانین میں ایسی شق بھی کیوں نہ رکھی جائے جس سے یتیم پوتوں کو بھی حصہ مل جائے۔ اس سے موجودہ مالکانِ اراضی کو کچھ نقصان نہیں ہوگا کیونکہ یہ حصہ پانسو ایکڑ سے زائد رقبہ میں سے ملے گا۔ لیکن مستحق محتاجوں کی دادرسی ہو جائیگی۔

ہم محترم صدر زرعی اصلاحات کمیشن کی خدمت میں پُرزور التماس کریں گے کہ وہ اس مسئلہ پر غور فرمائیں اور جہاں محروم الارث لڑکیوں کو حصہ دلایا گیا ہے، یتیم پوتوں کو بھی اس شق میں شامل کر لیا جائے۔ ان کا یہ فیصلہ قرآن کے مطابق ہوگا اور ہزار ہا مستحقین سے انصاف کا مستلزم۔

مجلسِ اقبال

درمعنیٔ ایں کہ کمالِ حیاتِ ملّیہ ایں است کہ ملّت مثلِ فرد احساسِ خودی پیدا کند، و تولید و تکمیلِ ایں احساس از ضبطِ روایاتِ ملّیہ ممکن گردد۔

زیرِ نظر باب میں حضرت علامہؒ اس حقیقت کو سامنے لاتے ہیں کہ جس طرح فرد کی زندگی اس کی ذات (PERSONALITY) سے وابستہ ہوتی ہے اسی طرح زندہ قوم بھی اپنی ذات (خودی) رکھتی ہے۔ البتہ اس کی یہ خودی اس کی تاریخ سے وابستہ ہوتی ہے۔ دوسرے مقام پر علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ جو مقام ایک فرد کی زندگی میں حافظہ کا ہوتا ہے۔ وہی مقام قوم کی زندگی میں اس کی تاریخ کو حاصل ہے۔ اس ضمن میں وہ پہلے (مثال کے طور پر) ایک نوزائیدہ بچے کے احوال و کوائف سے آغازِ سخن کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

کودکے را دیدی اے بالغ نظر

کو بود از معنیٔ خود بے خبر

بچے میں احساسِ خودی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ذات کی موجودگی تک سے بے خبر ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ۔

ناشناسِ دور و نزدیک آنچناں

ماہ را خواہد کہ گیرد در عناں

وہ بعدِ مکانی تک کا بھی احساس نہیں رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ چاند اس کی مٹھی میں آ جائے۔

از ہمہ بیگانہ آں ماکشت پرست

گریہ مست ۔ و شیر مست ۔ و خواب مست

وہ ہر ایک سے بیگانہ ہوتا ہے بجز اپنی ماں کے۔ وہ ماں کا پرستار ہوتا ہے۔ اس کی زندگی بس اتنی ہی ہوتی ہے کہ بھوک لگی تو رو پڑے۔ دودھ پیا اور سو گئے۔ پھر بھوک لگی تو جاگ کر رونا شروع کر دیا۔

زیر و بم را گوش او درگیر نیست
نغمہ اش جز شورشِ زنجیر نیست

اس کے کان موسیقی کے اتار چڑھاؤ سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔ اس کے لئے بہترین نغمہ زنجیر کا شور ہوتا ہے۔

سادہ و دوشیزہ افکارش ہنوز
چوں گہر پاکیزہ گفتارش ہنوز

اس کے افکار و تصورات بالکل صاف۔ سادہ اور غیر ملوث ہوتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی بناوٹ کا شائبہ یا آمیزش کا نشان تک نہیں ہوتا۔

جستجو سرمایۂ پندارِ او
از چرا چوں۔ کے۔ کجا گفتارِ او

اس کی طبیعت میں معلومات حاصل کرنے کی تڑپ ہوتی ہے۔ یہی وہ جذبۂ تجسس ہے جس سے اس کا علم بڑھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دن بھر پوچھتا رہتا ہے کہ یہ کیا ہے۔ وہ کیا ہے۔ یہ ایسا کیوں ہے۔ وہ ویسا کیوں ہو گیا۔ وہاں کب جانا ہوگا۔ وہ کہاں سے آیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے سوالات کا یہ سلسلۂ دراز اس کے جذبۂ تجسس کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

نقش گیرِ ایں و آں اندیشہ اش
غیر جوئی۔ غیر بینی پیشہ اش

لیکن اس کے یہ سوالات اپنے گرد و پیش کی اشیاء و اشخاص کے متعلق ہوتے ہیں۔ خود اپنی ذات کے متعلق تحقیق و تفتیش کا کوئی جذبہ اس کے اندر نمودار نہیں ہوتا۔

چشمش از دنبال اگر گیرد کسے
جانِ او آشفتہ می گردد بسے

اس تحقیق میں بھی وہ ہنوز ایسا خام ہوتا ہے کہ جو چیزیں اس کی آنکھوں کے سامنے ہوں وہ انھیں پہچانتا ہے لیکن قیاس سے کسی نتیجہ تک پہنچنا اس کے لئے از بس مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص پیچھے سے اس کی آنکھیں بند کر دے تو وہ بے حد پریشان ہو جاتا ہے کیونکہ وہ ہاتھوں کے انداز سے نہیں پہچان سکتا کہ اس کی آنکھیں کس نے بند کی ہیں۔

فکرِ خامش در ہوائے روزگار | پرکشا مانندِ بازِ نوشکار
در پئے نخچیر ہا بگذاردش | باز سوئے خویشتن می آردش

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب باز کو شکار کے لئے سدھاتے ہیں تو اسے اس کی مشق کراتے اور عادت ڈالتے ہیں کہ وہ شکار پر جھپٹے اور اسے اپنی گرفت میں لے کر پھر اپنے مستقر پر واپس آجائے۔ یہی کیفیت انسانی فکر کی ہے۔ وہ ابتداءً دوسری چیزوں کے متعلق تحقیق و جستجو کرتا ہے اور اس کے بعد اپنی ذات کی طرف آتا ہے۔ طفلِ نوآموز کے خارجی اشیاء کے متعلق استفسارات اسے آہستہ آہستہ خود اس کی اپنی ذات کی طرف متوجہ ہونے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔

تا ز آتش گیری افکار او — گل فشاند از رگ پندار او

چشم گیرایش فتد بر خویشتن — دستکے بر سینہ می گوید کہ "من"

اس طرح رفتہ رفتہ اس کے افکار کی حرارت سے اس کے "انا" کی پھلجھڑی شرارہ گیر ہو جاتی ہے اور جب وہ چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں اس کی آنکھ خود اس کی ذات پر پڑتی ہے اور وہ اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر "میں" کہتا ہے۔ اس طرح وہ خارجی دنیا سے خود اپنی داخلی دنیا کی طرف آجاتا ہے۔

یاد او با خود شناسائیش کند

حفظ ربط دوش و فردائیش کند

انسانی ذات کا احساس، اس کے حافظے سے وابستہ ہوتا ہے۔ جب فرد کے ذہن میں ماضی کے واقعات محفوظ ہو جاتے ہیں تو اس میں احساسِ انا بیدار ہو جاتا ہے۔ وہ ماضی کے آئینے میں اپنی اُس ذات کو منعکس دیکھتا ہے جو اسے حال میں نظر آتی ہے۔ اور اسی ذات کے سائے کو وہ مستقبل میں پھیلا دیتا ہے۔

سفتہ ایامش دریں تار زد اند

ہمچو گوہر از پئے یک دیگر اند

اس کی زندگی کے تمام واقعات اس حافظہ کی لڑی میں پروئے جاتے ہیں۔ اگر حافظہ نہ ہے تو اس تسبیح کے دانے بھی سب بکھر جائیں۔

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اگرچہ انسانی ذات کا احساس حافظہ سے وابستہ ہے لیکن انسانی ذات خود حافظہ (MEMORY) کا نام نہیں۔ حافظہ وہ ذریعہ (MEDIUM) ہے جس سے انسانی ذات کا احساس بیدار ہوتا ہے۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ (اسی سلسلہ میں) ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ جہاں تک انسانی جسم کا تعلق ہے علمائے سائنس ہمیں بتاتے ہیں کہ اس میں ہر آن "موت و حیات" کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جسم عبارت ہوتا ہے لاتعداد خلیات (CELLS) سے۔ یہ خلیات کروڑوں کی تعداد میں ہر آن ضائع ہوتے رہتے ہیں اور ان کی جگہ نئے خلیات وجود میں آجاتے ہیں۔ اس طرح دس سال (یا سات سال) کے عرصہ میں انسانی جسم کا کوئی پرانا خلیہ باقی نہیں رہتا۔ یعنی اتنے عرصے کے بعد انسان کا سابقہ جسم بالکل نیست و نابود ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک نیا جسم وجود میں آجاتا ہے۔ اگر ذات نام ہو

محض اس کے جسم کا، تو دس سال کے بعد سابقہ فرد کی جگہ ایک نئے فرد کو وجود میں آنا چاہیئے۔ لیکن انسان صرف طبعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔ وہ ذات جسم کے تغیرات سے قطعاً اثر پذیر نہیں ہوتی۔ جسم بنتا ہے بگڑتا ہے۔ پھر از سر نو وجود میں آتا ہے۔ لیکن انسانی ذات ویسے کی ویسی غیر متبدل باقی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچاس سال کا انسان جب اپنے بچپن کی باتیں یاد کرتا ہے تو وہ کبھی نہیں کہتا کہ وہ کسی دوسرے انسان کی باتیں ہیں۔ وہ پورے حتم و یقین کے ساتھ کہتا ہے کہ میں نے ایسا کیا تھا، اور میں نے ایسا کہا تھا۔ اسی حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

گرچہ ہر دم کاہد افزاید تنش
"من ہماستم کہ بودم" در دلش

اگرچہ اس بچے کا جسم ہر آن کم و بیش ہوتا رہتا ہے لیکن اس کا دل اس کا یقین رکھتا ہے کہ میں وہی ہوں جو پہلے تھا۔

ایں "من" نوزادہ آغازِ حیات
نغمہ بیدار مئ سازِ حیات

یہ "میں" کا احساس جو اس کے دل میں پہلی بار پیدا ہوتا ہے، اسی کو اس کی زندگی کی ابتدا سمجھئے۔ اس سے پہلے وہ محض حیوانی بچہ تھا۔ اب انسانی دنیا میں آیا۔

ملتِ نوزادہ مثلِ طفلک است　　طفلکے کو در کنارِ مادر است
طفلکے از خویشتن ناآگہے　　گوہرِ آلودۂ خاکِ رہے

ایک نوزائیدہ قوم بھی انسانی بچے کی طرح شعورِ خویش سے ناآشنا ہوتی ہے۔

بستہ با امروز او فرداش نیست
حلقہ ہائے روز و شب در پاش نیست

بچے کی طرح اس کے حافظے میں ہنوز تسلسل نہیں پیدا ہوتا۔ نہ اس کے وقائعِ زندگی میں ربط ہوتا ہے۔ نہ وہ واقعات باہمی ربط و ضبط سے تاریخ کی سلکِ مسلسل بنتے ہیں۔ وہ قوم ایک ایسے گوہرِ آبدار کی طرح ہوتی ہے جو مٹی میں پل رہا ہو۔

چشمِ ہستی را مثالِ مردم است
غیر را بینندہ و از خود گم است

اس کی مثال آنکھ کی پتلی کی سی سمجھو جو ساری دنیا کو دیکھتی ہے لیکن اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی۔ اس قوم کو شعورِ غیر تو ہوتا ہے لیکن وہ شعورِ خویش سے بیگانہ ہوتی ہے۔

صد گرہ از رشتۂ خود وا کند　　تا سرِ تارِ خودی پیدا کند

وہ ان ابتدائی مراحل سے آہستہ آہستہ آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ہر پیش افتادہ مشکل کو حل کرتی، ہر رکاوٹ کو دور کرتی۔ تا آنکہ اس میں شعورِ خویش کا احساس بیدار ہو جاتا ہے۔

گرم چوں افتد بکارِ روزگار
ایں شعورِ تازہ گردد پائیدار

وہ جوں جوں زندگی کے دشوار گذار مراحل کو حل کرتی ہے، اس کا شعورِ خویش پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

نقش ہا بردارد، اندازد، او
سرگذشتِ خویش را می سازد او

وہ زمانے کے ان دشوار گذار راستوں سے گذرتی ہے تو ماحول کے کچھ اثرات اخذ کرتی ہے اور کچھ اپنے اثرات (اقوش قدم کی شکل میں) زمانے کی سطح پر چھوڑتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح اس قوم کی تاریخ مرتب ہو جاتی ہے۔

فرد چوں پیوندِ ایامش گسیخت | شانۂ ادراکِ او دندانہ ریخت
قوم روشن از سوادِ سرگذشت | خود شناس آمد ز یادِ سرگذشت

جس طرح فرد کی یہ حالت ہے کہ اگر اس کے ذہن میں ماضی کے واقعات کا تسلسل اور ربط باقی نہ رہے تو اس کی فکری صلاحیت ختم ہو جاتی ہے (اور یہی چیز آگے چل کر دیوانگی کی شکل اختیار کر لیتی ہے جس میں شعورِ ذات یکسر گم ہو جاتا ہے) اسی طرح قوم بھی اپنی تاریخ کی یاد سے احساسِ خویش کو زندہ رکھ سکتی ہے۔

سرگذشت او گر از یادش رود
باز اندر نیستی گم می شود

اگر اس قوم کی تاریخ اس کے حافظے سے محو ہو جائے تو وہ اپنی ہستی کھو کر پھر پردۂ عدم میں چھپ جاتی ہے۔ اور اس طرح صفحۂ دہر پر اس کا نام و نشان باقی نہیں رہتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ

نسخۂ بود ترا اے ہوشمند
ربطِ ایام آمدہ شیرازہ بند

کسی قوم کی ہستی کا راز اس کے تاریخی تسلسل اور ربط میں ہے۔ اگر تاریخ اس کی شیرازہ بندی نہ کرے تو اس کا وجود ہی باقی نہ رہے۔

ربطِ ایام است ما را پیرہن
سوزنش حفظِ روایاتِ کہن

تاریخی تسلسل و ترتیب، قوم کے پیکر کے لئے بمنزلہ پیرہن کے ہے اور قدیم قومی روایات کا تحفظ اس پیرہن کے لئے سوئی کا

کام دیتا ہے۔

چیست تاریخ اے زخود بے گانہ
داستانِ قصۂ افسانہ؟

تم تاریخ کو کیا سمجھتے ہو؟ محض پرانی داستانیں؟ قصے، کہانیاں؟ اگر اس کے متعلق تمہارا تصور یہی ہے تو سمجھ لو کہ تم شعورِ ذات سے بے گانہ ہو۔ تاریخ، نہ محض واقعات کے ریکارڈ کا نام ہے اور نہ عہد پارینہ کی داستانوں کے مجموعہ سے عبارت۔

ایں ترا از خویشتن آگہ کند
آشنائے کار و مردِ رہ کند

اس سے تمہیں شعورِ ذات عطا ہوتا ہے۔ تم اس کے ذریعے اپنے آپ سے آگاہ ہوتے ہو۔ نیز ماضی کے تجربات سے تم مستقبل کے خطرات سے محفوظ رہ سکتے ہو۔ یہ چیز بھی تاریخ کی رُو سے حاصل ہو سکتی ہے۔

روحِ ما سرمایۂ تاب است ایں
جسمِ ملت را چوں اعصاب است ایں

اس سے قوم کی رُوح میں حرارت اور توانائی پیدا ہوتی ہے۔ اس کی حیثیت ملت کے جسم میں ایک اعصاب کی سی ہے۔

ہمچو خنجر بر فسانت می زند
باز بر روئے جہانت می زند

جس طرح تلوار کی دھار کو تیز کرنے کے لئے اُسے سان پر چڑھاتے ہیں، اسی طرح قوم اپنی ماضی کے تجربات سے اپنے اندر شدت اور صلابت پیدا کر لیتی ہے۔ اور یوں اس کے اندر ہر مخالف قوت سے ٹکرانے کی قوت اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

دہ چہ سازِ جاں نگارد دلپذیر
نغمہ ہائے رفتہ در تارش اسیر

موسیقی کے سازوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ جو نغمے ہنوز نمود میں نہیں آئے وہ ان میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ جو نغمے ان سے نکل کر فضا میں پھیل چکے ہیں وہ (گراموفون کے ریکارڈز کی طرح) اُن سازوں میں محفوظ رہ جائیں۔ لیکن تاریخ ایک ایسا ساز ہے جس میں ماضی کے نغمات محفوظ رہتے ہیں۔

شعلۂ افسردہ در سوزش نگر
دوش در آغوشِ امروزش نگر

اس کی حرارت میں تمہیں ماضی کے بجھے ہوئے شعلے پنہاں نظر آئیں گے۔ اس کے "امروز" میں کل (ماضی) کے تمام جلوے جھلمل جھلمل کرتے دکھائی دیں گے۔

شمع او بخت امم را کوکب است
روشن از وے امشب و ہم دیشب است

تاریخ کی روشنی، قوموں کی تقدیر کا ستارہ بنتی ہے۔ اسی سے ان کا ماضی درخشندہ ہوتا ہے اور حال تابندہ۔

چشم پُر کارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را

آنکھ پیچھے کی طرف کبھی نہیں دیکھ سکتی۔ وہ صرف آگے کی سمت دیکھ سکتی ہے۔ لیکن تاریخ کی آنکھ پیچھے کی طرف بھی دیکھتی ہے اور اس طرح ماضی کو تمہارے سامنے دوبارہ زندہ کر دیتی ہے۔

بادۂ صد سالہ در مینائے او
مستیٔ پارینہ در صہبائے او

اس کی صراحی میں سینکڑوں سال کی پرانی شراب بند ہوتی ہے اور اس کی شراب میں کہنہ (اور پختہ) نشہ بھر رہتا ہے۔

صید گیرے کو بدام اندر کشید
طائرے کز بوستان ما پرید

تاریخ وہ شکاری ہے جو ان تمام پرندوں کو اپنے جال میں پھانستا ہے جو مدت ہوئی صحن چمن ملت سے اڑ گئے تھے۔

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو
از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو

تمہیں چاہیئے کہ اپنی تاریخ کو محفوظ رکھو اور اس طرح دنیا میں محکم اور پائندہ ہو جاؤ۔ انسانی جسم کی زندگی کا دار و مدار آنے والے سانس میں ہوتا ہے۔ لیکن جسد ملت کی زندگی کا دار و مدار ان سانسوں پر ہے جو ماضی میں لئے جا چکے ہوں۔

دوش را پیوند با امروز کن
زندگی را مرغ دست آموز کن

اپنے ماضی کو حال کے ساتھ ملا دو۔ اور اس طرح زندگی کو سدھائے ہوئے پرندے میں تبدیل کر لو کہ وہ اڑ کر کہیں دور نہ نکل جائے۔ ہر وقت تمہارے قبضے میں رہے۔

رشتۂ ایام را آور بدست
ورنہ گردی روز کور و شب پرست

اپنی تاریخ کو ہمیشہ اپنے ہاتھ میں رکھو۔ اسے نظروں سے اوجھل نہ ہونے دو۔ اگر ایسا نہ کروگے تو تمہاری حالت اس شخص جیسی ہو جائے گی جسے دن کی روشنی میں کچھ نظر نہ آئے۔ اس لئے وہ چمگادڑ کی طرح رات کی تاریکیوں میں زندگی بسر کرنا پسند کرے۔

سر زند از ماضیٔ تو حالِ تو
خیزد از حالِ تو استقبالِ تو

ماضی، حال اور مستقبل ایک دوسرے سے الگ زمانے نہیں ہیں۔ ماضی آگے بڑھتا ہے تو حال بن جاتا ہے۔ اور حال سے مستقبل پیدا ہو جاتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ جسے حال کہا جاتا ہے وہ ماضی کا مستقبل اور مستقبل کا ماضی ہے۔ اس لئے زندہ قوم ماضی حال اور مستقبل کے تسلسل کو قائم رکھتی ہے۔

مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال

جو قوم اپنے حال کو ماضی سے پیوستہ اور مستقبل کو حال سے وابستہ رکھتی ہے اسے لازوال زندگی حاصل ہو جاتی ہے حقیقت یہ ہے کہ

موجِ ادراکِ تسلسل زندگی است
مے کشاں را شورِ قلقل زندگی است

زندگی، تسلسل (CONTINUITY) کا نام ہے جہاں اس میں انقطاع واقع ہوا، زندگی ختم ہو گئی۔ جو قومیں اپنی جد و جہد کو مسلسل قائم نہیں رکھتیں، وہ زندہ نہیں رہ سکتیں۔ جو کچھ کسی قوم نے ماضی میں کیا ہو، اس کے نتائج اس کے زمانۂ حال میں اس کے سامنے آتے ہیں۔ جو کچھ وہ حال میں کرتی ہے۔ اس سے اس کا مستقبل مرتب ہوتا ہے۔

اس شعر پر زیرِ نظر باب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس ضمن میں ایک نکتہ وضاحت چاہتا ہے۔ چونکہ قوموں کی زندگی ان کی تاریخ سے وابستہ ہوتی ہے۔ اسلئے چالاک اور پُرفن قومیں، دوسری قوموں کی تاریخ کو اس طرح مسخ کر دیتی ہیں کہ ان کے عیوب انھیں محاسن بن کر دکھائی دیتے ہیں اور یوں ان کے استقام (استمرار و ہمیشگی) حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی قوم اپنے عیوب کو محاسن سمجھنے لگ جائے اور اپنے ماضی پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کے لئے تیار نہ ہو، وہ کبھی دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتی۔ ہم (مسلمانوں) کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ہماری تاریخ بڑی مسخ شدہ صورت میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ لیکن ہم نے (بدقسمتی سے) اس کے گرد ایسا تقدس کا ہالہ کھینچ دیا ہے کہ کسی کو اس کی طرف نگہِ تنقید سے دیکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ

تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا

وہ تمام تصورات و نظریات جنھیں مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا، اس مسخ شدہ تاریخ کی سند سے ایک ایک کر کے

جشن نو اسلام بگجمین اسلام بن چکے ہیں۔ اگر کوئی اور قوم ان حالات کا شکار ہو جاتی تو اس کے لئے اس دلدل سے نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن (ہماری خوش بختی ہے کہ) ہماری حالت، دیگر اقوامِ عالم سے مختلف ہے۔ ہمارے پاس غلط اور صحیح کے پرکھنے کا ایک ایسا معیار ہے جس میں نہ آج تک کسی قسم کا تغیر و تبدل ہوا ہے نہ آئندہ ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ معیار ہے خدا کی زندہ و پائندہ کتاب۔ ہماری بازآفرینی کے لئے طریق کار یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو قرآن کے معیار پر پرکھ کر دیکھیں۔ جو اس کے مطابق ہو اسے حق سمجھیں۔ جو اس کے خلاف ہو اُسے عیب قرار دیں۔ اور اس طرح اپنی کی غلطیوں سے عبرت حاصل کر کے اپنے مستقبل کو صحیح خطوط پر متشکل کر لیں۔ اس کے سوا ہماری حیاتِ نو کی کوئی شکل نہیں۔

اقبال اور قرآن

از: پرویز

علامہ اقبالؒ کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ

۲۵۶ صفحات — قیمت: دو روپے

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

قرآن کی حقیقت

(ہمارے اربابِ شریعت کی نظروں میں)

ماہنامہ ترجمان القرآن بابت فروری ۱۹۵۹ء کے "رسائل و مسائل" کے باب میں حسبِ ذیل سوال شائع ہوا ہے۔ مستفسر نے کہا ہے کہ اعتراض ان کے ایک شیعہ دوست کا ہے۔

آیتِ وضو (پارہ ۶۔ رکوع ۶) میں فَاغْسِلُوْا اور وَامْسَحُوْا دو فعل استعمال ہوئے ہیں۔ پہلے سے چہرے اور کہنیوں تک دھونے کا حکم ہے۔ اور دوسرے سے پیروں اور سر کے مسح کرنے کا حکم ہے۔ سمجھنا یہ مقصود ہے کہ اہلِ سنت پیر دھوتے ہیں۔ پیروں کا مسح کیوں نہیں کرتے۔ یہ بات کہاں سے ظاہر ہوتی ہے کہ پیر وضو کے آخر میں دھوئے جائیں۔ جواب مفصل اور واضح ہونا چاہیئے۔

سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اس سوال کا حسبِ ذیل جواب لکھا ہے۔

جواب۔ آیتِ وضو (سورۂ مائدہ، رکوع دوم) کے متعلق شیعوں اور سنیوں کے درمیان یہ اختلاف بہت پرانا ہے کہ آیا اس میں پاؤں دھونے کا حکم دیا گیا ہے یا صرف ان پر مسح کرنے کا۔ آپ کے دوست کو یہ غلط فہمی ہے کہ قرآن میں صاف پیروں کے مسح کرنے کا حکم ہے اور اہلِ سنت نے محض حدیث کی بنیاد پر دھونے کا مسلک اختیار کر لیا ہے اگر صاف حکم یہی موجود ہوتا تو پھر کس کی مجال تھی کہ اس کے خلاف عمل کرتا۔ اصل مختلف فیہ سوال تو یہی ہے کہ قرآن فی الواقع ان دونوں فعلوں میں سے کس کا حکم دیتا ہے۔ اور اس کا حقیقی منشا کیا ہے۔

آیت کے الفاظ یہ ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ۔ (۵ : ۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم اٹھو نماز کے لئے تو دھو لو اپنے منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک اور مسح کر و اپنے سروں پر اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک۔

اس میں لفظ وَاَرْجُلَكُمْ کی دو قرائتیں متواتر ہیں۔ نافع، ابن عامر، حفص، کسائی اور یعقوب کی قرأت وَاَرْجُلَكُمْ (بفتح لام) ہے اور ابن کثیر، حمزہ، ابوعمرو اور عاصم کی قرأت وَاَرْجُلِكُمْ (بکسر لام)۔ ان میں سے کسی قرأت کی حیثیت بھی یہ نہیں ہے کہ بعد میں کسی وقت بیٹھ کر نحویوں نے اپنے اپنے فہم اور منشاء کے مطابق الفاظ قرآنی پر خود اعراب لگا دیئے ہوں بلکہ یہ دونوں قرائتیں متواتر طریقے سے منقول ہوئی ہیں۔ اب اگر پہلی قرأت اختیار کی جائے تو وَاَرْجُلَكُمْ کا تعلق فَاغْسِلُوْا کے حکم سے جڑتا ہے اور معنی یہ ہو جاتے ہیں "اور دھوؤ اپنے پاؤں ٹخنوں تک" اور اگر دوسری قرأت قبول کی جائے تو اس کا تعلق وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ سے قائم ہوتا ہے اور معنی یہ نکلتے ہیں "اور مسح کرو اپنے پاؤں پر ٹخنوں تک"۔

یہ صریح اختلاف ہے جو ان دو معروف و مشہور اور متواتر قرأتوں کی وجہ سے آیت کے معنی میں واقع ہو جاتا ہے۔ اس تعارض کو رفع کرنے کی ایک صورت یہ ہے کہ دونوں قرأتوں کو کسی ایک ہی مفہوم (غسل یا مسح) پر محمول کیا جائے۔ لیکن اس کی جتنی کوششیں بھی کی گئی ہیں وہ ہمیں کسی قطعی نتیجے پر نہیں پہنچاتیں کیونکہ جتنے وزنی دلائل کے ساتھ ان کو غسل پر محمول کیا جا سکتا ہے قریب قریب اتنے ہی وزنی دلائل مسح پر محمول کرنے کے حق میں بھی ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ محض قواعد زبان کی بنا پر ان میں سے کسی ایک معنی کو ترجیح دی جائے۔ لیکن یہ صورت بھی مفید مطلب نہیں، کیونکہ دلائل ترجیح دونوں پہلوؤں میں قریب قریب برابر ہیں۔ اب آخر اس کے سوا چارہ کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے عمل کو دیکھا جائے۔

ظاہر ہے کہ وضو کا حکم کہیں خلا میں تو نہیں دیا گیا اور نہ وہ محض قرآن کے مصحف پر لکھا ہوا ہمیں مل گیا ہے۔ یہ تو ایک ایسے فعل کا حکم ہے جو پنج وقتہ نمازوں کے موقع پر عمل کرنے کے لئے دیا گیا تھا۔ خود حضورؐ اس پر ہر روز کئی کئی بار عمل فرماتے تھے۔ اور آپ کے ہزارہا متبعین مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب روزانہ اس حکم کی تعمیل اُس طریقے پر کرتے تھے جو انہوں نے آنحضورؐ کے قول اور عمل سے سیکھا تھا۔ آخر ہم کیوں نہ یہ دیکھیں کہ قرآن کے اس حکم پر ہزارہا صحابہ نے حضورؐ کو اور بعد کے بے شمار مسلمانوں نے صحابہؓ کو کس طرح عمل کرتے دیکھا؟ قرآن کے الفاظ سے جو بات واضح نہ ہوتی ہو اسے سمجھنے کے لئے اس ذریعہ سے زیادہ معتبر ذریعہ اور کونسا ہو سکتا ہے؟

اس ذریعہ علم کی طرف جب ہم رجوع کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ صحابہ کی اتنی کثیر تعداد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پاؤں دھونے کے قول اور عمل کو نقل کرتی ہے اور تابعین کی اس سے بھی زیادہ تعداد صحابہ سے اس کو روایت کرتی ہے کہ اس خبر کی صحت میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ درست ہے کہ کچھ تھوڑی سی روایات مسح کے حق میں بھی ہیں، لیکن ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا عمل مسح کا تھا۔

بلکہ دو تین صحابیوں کی اپنی رائے یہ تھی کہ قرآن صرف مسح کا حکم دیتا ہے۔ نیز ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض صحابہ اگر وضو سے ہوتے اور پھر نماز کے وقت تجدید وضو کرنا چاہتے تو صرف مسح پر اکتفا کرتے تھے۔ دوسری طرف متعدد مستند روایات خود اہل تشیع کے ہاں ایسی ملتی ہیں جن سے پاؤں دھونے کا حکم اور عمل ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً محمد بن نعمان کی روایت ابو عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے جس کو کلینی اور ابو جعفر طوسی نے بھی صحیح سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں کہ "اگر تم سر کا مسح بھول جاؤ اور پاؤں دھو بیٹھو تو پھر سر پر مسح کرو اور دوبارہ پاؤں دھولو"۔ اسی طرح محمد بن حسن الصفّار حضرت زید بن علی سے وہ اپنے والد امام زین العابدین سے، وہ اپنے والد امام حسین سے، اور وہ اپنے والد سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے اُن کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ "میں وضو کرنے بیٹھا، سامنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ میں جب پاؤں دھونے لگا تو آپ نے فرمایا اے علی، انگلیوں کے درمیان خلال کر لو"۔ الشریف الرضی نے نہج البلاغہ میں حضرت علیؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی جو کیفیت نقل کی ہے، اس میں بھی وہ پاؤں دھونے ہی کا ذکر فرماتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ روایات کا غالب حصہ تمام تر غسل قدمین کے حق میں ہے اور محض مسح کی تائید بہت ہی کم اور سنداً و معنیً کمزور روایتیں کرتی ہیں۔

اب عقل کے لحاظ سے دیکھئے تو پاؤں دھونے ہی کا عمل زیادہ معقول اور قرآن کے منشاء سے قریب تر محسوس ہوتا ہے۔ وضو میں جتنے اعضاء کی صفائی کا حکم دیا گیا ہے، ان میں سب سے زیادہ گندگی اور میل کچیل لگنے کا امکان اگر کسی عضو کو ہے تو وہ پاؤں ہی ہیں۔ اور سب سے کم جس حصہ جسم کے آلودہ ہونے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں وہ سر ہے۔ یہ عجیب بات ہوگی کہ دوسرے سب اعضاء کو تو دھونے کا حکم ہو اور پاؤں مسح کے حکم میں سر کے ساتھ شامل کئے جائیں۔ پھر پاؤں پر مسح اگر وضو کے آخر میں کیا جائے تو لامحالہ گیلے ہاتھ ہی پھیرنے ہوں گے۔ اس صورت میں پاؤں پر جو گرد و غبار یا میل کچیل موجود ہوگا وہ گیلے ہاتھ پھیرنے سے اور بھی زیادہ گندا ہو جائے گا۔ علاوہ بریں اگر آدمی پاؤں پر صرف مسح کرے تو آیت کے دو محتمل معنوں میں سے ایک (یعنی غسل قدمین) لازماً چھوٹ جاتا ہے اور صرف ایک ہی مفہوم کی تعمیل ہوتی ہے۔ لیکن اگر آدمی پاؤں دھوتے بھی اور اچھی طرح ہاتھوں سے مل کر ان کو صاف بھی کرے تو آیت کے دونوں مفہوموں پر بدرجہ اتم عمل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں غسل اور مسح دونوں جمع ہو جاتے ہیں۔

البتہ مسح کے حکم پر عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حالت میں کیا ہے جبکہ آپ موزے پہنے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ آیت کے دوسرے مفہوم سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ بکثرت روایات صحیحہ سے بھی ثابت ہے اور سراسر معقول بھی۔ مگر تعجب ہے کہ شیعہ حضرات اسے نہیں مانتے۔ حالانکہ یہ ان کے اپنے مسلک سے بھی قریب تر ہے۔

یہ ہے مودودی صاحب کا جواب۔ اس سلسلہ میں ایک دو ایسے سوال پیدا ہوتے ہیں جنہیں ہم قارئین طلوع اسلام کے سامنے لانا ضروری سمجھتے ہیں۔

قرآن کریم جو راہ نمائی عطا کرتا ہے اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ صرف اصولی حکم دیتا ہے۔ اس حکم کی تفاصیل بیان نہیں کرتا۔ لیکن بعض صورتوں میں وہ احکام کی تفاصیل و جزئیات بھی خود ہی متعین کرتا ہے۔ وضو کا حکم اسی گروہ میں شامل ہے۔ لیکن جو کچھ مودودی صاحب نے لکھا ہے اس سے واضح ہے کہ قرآن کریم اتنی سی بات بھی قطعی طور پر نہیں بتا سکتا کہ وضو میں پاؤں دھونے چاہئیں یا ان پر مسح کرنا چاہیئے۔ اور اس باب میں اس کے سوا چارہ ہی نہیں رہتا کہ قرآنی منشا کو معلوم کرنے کے لئے انسان اور گوشوں کی طرف رجوع کرے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قرآن کی (معاذ اللہ) یہ کیفیت ہے کہ وہ اتنی سی بات بھی بالوضاحت، حتمی اور قطعی طور پر نہیں بتا سکتا، وہ زندگی کے اہم معاملات میں کیا راہنمائی دے گا؟ جسے (پناہ بخدا) یہ چیز بھی وضاحت سے کہنے کا سلیقہ نہیں آتا (کہ پاؤں دھونے چاہئیں یا ان پر مسح کرنا چاہیئے) وہ کائنات اور زندگی کے حقائق کی تبیین کیا کرے گا۔

اب آگے بڑھیئے۔ مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ اس آیت میں قرآن کی دو قرأتیں ہیں۔ دونوں معروف و مشہور اور متواتر ہیں۔ دونوں کی تائید میں دلائل کا وزن برابر ہے۔ ان میں مطابقت و موافقت پیدا کرنے کی جتنی کوششیں کی گئی ہیں وہ سب ناکام رہی ہیں اور امت اس باب میں کسی قطعی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو قرآن ہمارے پاس متداول ہے (اور جس میں اَرْجُلَکُمْ لَ کے فتح یعنی زبر سے لکھا ہوا ہے) اس کے علاوہ کوئی اور قرآن بھی ہے جس میں اَرْجُلِکُمْ لَ کے کسرہ۔ یعنی زیر سے لکھا ہوا ہے) اور ان دونوں قرأتوں میں اس قدر اختلاف ہے کہ ایک میں "پاؤں دھونے" کا حکم ہے اور دوسرے میں "مسح کرنے" کا۔ یہ دونوں قرآن "معروف و مشہور و متواتر" ہیں۔ (واضح رہے کہ ایک آیت کی دو قرأتوں کے معنی ہی یہ ہیں کہ ایک قرآن میں وہ آیت اس طرح لکھی ہے اور دوسرے میں دوسری طرح)۔ ہم تو یہی سمجھ رہے تھے کہ جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے، صرف وہی قرآن ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور قرآن نہیں۔ یہ وہی قرآن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی نبی اکرمؐ کو دیا اور نبی اکرمؐ نے امت تک پہنچایا۔ اس قرآن میں جو حضورؐ نے امت کو دیا تھا اور اس قرآن میں جو ہمارے پاس موجود ہے، لفظاً و حرفاً تو ایک طرف زیر و زبر کا بھی فرق نہیں۔ (واضح رہے کہ عربی زبان میں زیر، زبر، یعنی اعراب۔ کے فرق سے الفاظ کے معانی میں زمین آسمان کا فرق ہو جاتا ہے)۔ لیکن جو کچھ مودودی صاحب نے فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن دو قسم کے ہیں۔ ایک میں اعراب کچھ ہیں اور دوسرے میں کچھ۔

اس سلسلہ میں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ

(۱) جو قرآن اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو دیا تھا کیا وہ دو قسم کا تھا؟ یعنی ایک میں اعراب ایک طرح کے تھے اور دوسرے میں دوسری طرح کے؟

(۲) یا کیا یہ صورت تھی کہ خدا نے تو ایک ہی قسم کا قرآن دیا تھا لیکن جب اسے نبی اکرمؐ نے امت تک پہنچایا تو

(معاذ اللہ) کسی کو ایک قسم کا دیا اور کسی کو دوسری قسم کا ؟

(۳) اگر خدا نے (یا اس کے رسول نے) ایسی مختلف قرأتوں والے قرآن دیئے تھے جن سے آیات کے معانی میں ایسا صریح اختلاف واقع ہو جاتا ہے تو قرآن کریم کی اس آیت کا مفہوم کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۴/۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے۔ اور اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں کئی اختلافات پاتے۔

(۴) اگر رسول اللہؐ نے امت کو دو قسم کا قرآن دیا تھا تو پھر یہ کیوں ہے کہ امت میں ایک ہی قسم کا قرآن رائج ہے۔ دوسری قرأت والے قرآن کو کیا ہوا؟ وہ کہاں گیا؟ امت میں وہ قرآن رائج کیوں نہیں؟ یا مروجہ قرآن میں دونوں قرأتیں کیوں نہیں دی گئیں؟

اب ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کی اتنی کثیر تعداد رسول اللہؐ سے پاؤں دھونے کے قول اور عمل کو نقل کرتی ہے۔ اور تابعین کی اس سے بھی زیادہ تعداد صحابہ سے اس کو روایت کرتی ہے کہ اس خبر کی صحت میں شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ یہ درست ہے کہ تھوڑی سی روایات مسح کے حق میں بھی ہیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ رسول اللہؐ اور صحابہؓ کا عمل مسح کا تھا بلکہ دو تین صحابیوں کی اپنی رائے یہ تھی کہ قرآن صرف مسح کا حکم دیتا ہے۔

اس سے حسبِ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ

(۱) جب آیت مذکورہ کی دونوں قرأتیں "معروف و مشہور و متواتر" طریقے سے منقول ہیں تو پھر یہ کیوں ہوا کہ رسول اللہؐ اور صحابہ کی اتنی کثیر تعداد نے صرف ایک قرأت کے مطابق عمل کیا اور دوسری کو چھوڑ دیا؟ کیا دوسری قرأت قرآن کی نہیں تھی؟ اس قرأت کے مطابق عمل نہ کرنے سے کیا یہ لازم نہیں آتا کہ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) رسول اللہؐ اور صحابہؓ قرآن کے ایک ایسے حکم کے خلاف عمل کرتے رہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا۔

(۲) اگر دونوں قرأتیں خدا کی طرف سے تھیں اور خدا کا منشا یہ تھا کہ کبھی پاؤں دھوئے جائیں اور کبھی ان پر مسح کیا جائے تو نبی اکرمؐ نے مستقلاً ایک ہی حکم پر کیوں عمل کیا۔ دوسرے پر کیوں نہ کیا؟

(۳) جو صحابہؓ مسح کے حق میں تھے۔ ان کے متعلق یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ "یہ ان کی اپنی رائے تھی" جب دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دوسری قرأت بھی ویسی ہی "معروف مشہور اور متواتر" ہے جیسی پہلی قرأت۔

(۴) اگر کوئی شخص آج وضو میں پاؤں پر مسح کرے تو اس کا یہ عمل قرآن کی اُس قرات کے تو مطابق ہوگا جس میں اَرْجُلِکُم (ل کا کسرہ) ہے لیکن رسول اللہ اور صحابہؓ کے عمل کے خلاف ہوگا۔ ایسے عمل کے متعلق کیا حکم ہوگا جو قرآن کے مطابق ہو لیکن سنتِ رسول اللہؐ کے خلاف؟

(۵) مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ "بعض صحابہ اگر وضو سے ہوتے اور پھر نماز کے وقت تجدید وضو کرنا چاہتے تو صرف مسح پر اکتفا کرتے۔" سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم نے کہیں بھی یہ کہا ہے کہ جب تم پہلی بار وضو کیا کرو تو پاؤں دھویا کرو۔ لیکن جب تجدید وضو کرو تو پاؤں کا مسح کیا کرو؟

اب اور آگے چلئے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ

عقل کے لحاظ سے دیکھئے تو پاؤں دھونے ہی کا عمل زیادہ معقول اور قرآن کے منشاء سے قریب تر محسوس ہوتا ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ مودودی صاحب کے نزدیک قرآن کا یہ حکم معقول ہے کہ وضو میں پاؤں دھونے چاہئیں۔ لیکن جب وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ دوسری قرات بھی (جس کی رُو سے پاؤں پر مسح کرنے کا حکم دیا گیا ہے) قرآن ہی کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن بیک وقت معقول بات کا بھی حکم دیتا ہے اور (معاذ اللہ) غیر معقول بات کا بھی!

پھر آپ یہ لکھتے ہیں کہ پاؤں دھونا "قرآن کے منشاء سے قریب تر ہے۔" سوال یہ ہے کہ جب آپ کے نزدیک پاؤں دھونے اور مسح کرنے کی دونوں قراتیں قرآن کی ہیں تو آپ کو یہ کیسے معلوم ہوگیا کہ قرآن کا منشاء یہ ہے کہ پاؤں دھوئے جائیں ان پر مسح نہ کیا جائے۔ اور اگر قرآن کا منشاء یہی تھا کہ پاؤں دھوئے جائیں تو پھر اسے کونسی مجبوری تھی کہ وہ اپنے منشاء کے خلاف بھی ایک حکم دے؟

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اُسے آپ غور سے دیکھئے اور پھر سوچئے کہ اس قسم کے عقائد کے بعد جو یہ حضرات قرآن کے متعلق خود رکھتے اور دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہیں' قرآن کریم کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے؟ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس عقیدہ کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ اس کی بنیاد ہیں وہ روایات جن میں کہا گیا ہے کہ قرآن کریم کی مختلف قراتیں ہیں۔ یعنی اس کے الفاظ (روایات) میں اختلاف ہے۔ اس اختلاف کی کیفیت یہ ہے کہ ان روایات کی رو سے کم وبیش تمام جلیل القدر صحابہؓ (مثلاً حضرت عمرؓ حضرت علیؓ۔ حضرت ابی ابن کعب۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود۔ حضرت عبداللہ ابن عباس۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاص۔ حضرت عائشہ وغیرہ رضی اللہ عنہم) کے پاس الگ الگ مصاحف (قرآن) تھے جن میں اور اس قرآن میں جسے حضرت عثمانؓ نے امت میں پھیلایا تھا' بہت سے اختلافات تھے۔ ان اختلافات کی مقدار (یا تعداد) کا اندازہ اس سے لگایئے کہ صرف حضرت ابن مسعودؓ کے قرآن میں ڈیڑھ سو کے قریب

اختلافی مقامات تھے۔ اور اختلافات بھی اس قسم کے (مثلاً) سورۃ بقرہ میں ہے لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ ۔ اس کے بجائے ان کے مصحف میں تھا لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ فِي مَوَاسِمِ الْحَجِّ فَابْتَغُوا حِينَئِذٍ ۔ یا مثلاً سورۃ والعصر میں ان کے مصحف میں یہ الفاظ بطور ایک آیت کے زائد تھا۔ وَإِنَّهُ فِيهِ إِلَى آخِرِ الدَّهْرِ ۔ حضرت عمرؓ کے مصحف میں سورۃ فاتحہ کی یہ آیت (صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ) یوں تھی۔ صِرَاطَ مَنْ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَغَيْرِ الضَّالِّينَ ۔[1]

روایات یہ بھی بتاتی ہیں کہ ان اختلافات کو خود نبی اکرمؐ کی سند حاصل تھی۔ چنانچہ بخاری (باب "قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے") میں حسب ذیل روایت ملتی ہے۔

> مسور ابن مخرمہ اور عبدالرحمٰن بن عبد قاری حضرت عمرؓ سے سن کر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے ہشام بن حکیم (ابن حزام) کو رسول اللہ صلعم کی زندگی میں سورۂ فرقان پڑھتے ہوئے سنا۔ میں نے ان کا پڑھنا سنا تو وہ بہت سارے ایسے الفاظ پڑھ رہے تھے جو رسول اللہ صلعم نے مجھے نہیں پڑھائے تھے۔ قریب تھا کہ میں نماز ہی میں ان پر حملہ کر بیٹھوں۔ مگر میں نے بمشکل صبر کیا۔ حتیٰ کہ انہوں نے سلام پھیرا تو میں نے انہی کی چادر میں انہیں کس لیا اور میں نے ان سے پوچھا کہ یہ سورت جو میں نے تمہیں پڑھتے ہوئے سنی ہے تمہیں کس نے پڑھائی؟ انہوں نے کہا کہ مجھے تو رسول اللہ صلعم نے پڑھائی ہے۔ میں نے کہا تو جھوٹ بولتا ہے کیونکہ رسول اللہ صلعم نے خود مجھے اس کے خلاف پڑھائی ہے جو تو پڑھ رہا تھا۔ میں اس کو کھینچتا ہوا رسول اللہ صلعم کی طرف لے چلا اور میں نے رسول اللہ صلعم سے کہا کہ میں نے اس کو سورۂ فرقان کو ایسے الفاظ میں پڑھتے ہوئے سنا ہے جو آپ نے مجھے نہیں پڑھائے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا "انہیں چھوڑ دو۔ ہشام! پڑھو۔" چنانچہ ہشام نے اسی طرح رسول اللہ کے سامنے پڑھ دیا جیسا کہ میں نے پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ اس پر رسول اللہ صلعم نے فرمایا "یونہی تو نازل ہوئی ہے۔" پھر فرمایا "عمر! اب تم پڑھو" چنانچہ جس طرح حضورؐ نے مجھے پڑھائی تھی میں نے پڑھ کر سنائی تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا "یوں بھی نازل ہوئی ہے۔" اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ "یہ قرآن تو سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ لہٰذا جس طرح آسان ہو پڑھ لیا کرو۔"

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ان روایات کی رو سے قرآن نازل کرنے والے (خدا)، جس پر قرآن نازل ہوا (رسول) اور خود قرآن کریم کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے۔ یہی ہیں وہ روایات جن کی بنا پر مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ قرآن میں یہی حکم ہے کہ وضو میں پاؤں دھویا کرو اور یہ بھی کہ پاؤں کا مسح کیا کرو۔ یہ حقیقت ہے کہ دین کا سارا دارومدار یقین پر ہے

---

[1] ان امور کی تفصیل "مقام حدیث" جلد دوم میں دیکھئے۔

یقین اس پر کہ جو کچھ قرآن میں لکھا ہے وہ حرفاً حرفاً منجانب اللہ ہے۔ اسلام کے خلاف جو سازشیں ہوئیں ان میں سب سے بڑی سازش یہ تھی کہ قرآن کے متعلق مسلمانوں کے اس یقین کو متزلزل کر دیا جائے۔ اس کے لئے ایک عقیدہ قراتوں کے اختلاف کا وضع کیا گیا۔ اور پھر اس کی بنیادوں پر وہ تمام رنگا رنگ عمارتیں استوار ہو گئیں جن کی رو سے یہ مشہور کر دیا گیا کہ مختلف صحابہؓ کے پاس مختلف قرآن تھے۔ ظاہر ہے کہ جب قرآن کے متعلق بھی یہ یقین باقی نہ رہے کہ یہ لفظاً لفظاً وہی ہے جو خدا کی طرف سے نبی اکرمؐ کو ملا تھا تو پھر دین میں کونسی چیز غیر مشکوک رہ جاتی ہے۔ اگر ہمارے یہ علمبرداران شریعت قرآن کے خلاف ایسی کھلی ہوئی سازش کو بدقسمتی سے دین نہ بنا بیٹھے ہوتے تو مودودی صاحب سے جو سوال پوچھا گیا تھا اس کا سیدھا سادا دو ٹوک جواب یہ تھا کہ قرآن کریم میں وضو کے متعلق صاف حکم موجود ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ تم اپنے منہ۔ کہنیوں تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھوؤ۔ اور سر کا مسح کرو۔ اور اگر کوئی شخص (اختلافِ قرأت والی) روایت کو سامنے لاتا تو اس سے کہہ دیا جاتا کہ جو قرآن ہمارے پاس ہے وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔ اس لئے اگر کوئی روایت یہ کہتی ہے کہ اس سے مختلف بھی کوئی قرآن ہے تو وہ روایت غلط ہے۔ خدا کی کتاب میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے۔ نہ ہو سکتا ہے۔ نہ ہی اسکی کوئی اور قرات ہے۔

اسی سے آپ نے اس بات کا بھی اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ان حضرات سے جب کہا جاتا ہے کہ قانون شریعت کی بنیاد قرآن پر ہونی چاہیئے تو یہ اس سے گھبراتے کیوں ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کے متعلق ان کا عقیدہ وہ ہے جس کا اظہار مودودی صاحب نے اپنے جواب میں فرمایا ہے۔ اس عقیدہ کی رو سے لامحالہ انسان یہی کہے گا کہ جب قرآن اتنی سی بات بھی واضح اور قطعی طور پر بیان نہیں کر سکتا کہ وضو میں پاؤں دھونے چاہئیں یا مسح کرنا چاہیئے تو اسے زندگی کے اہم معاملات میں قانون سازی کی بنیاد کیسے بنایا جا سکتا ہے؟

یہ ہے ہمارے ان ارباب شریعت کی نگاہوں میں قرآن عظیم کی حیثیت۔ اس کے بعد غیر مسلموں پر کیا گلہ ہو سکتا ہے؟

ز گلفروش ننالم کز اہلِ بازار است
تپاکِ گرمئ رفتارِ باغبانم سوخت

جوئے نور

از:- پرویز — قیمت:- چھ روپے

کیا اخلاقِ رذیلہ کے بیشتر اسباب اقتصادی نہیں؟

(استاد محمد غزالی مصری)

طلوعِ اسلام نے قرآن کریم کی جو تعلیم عام کی ہے اس کا ایک اہم گوشہ یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے مفلسی اور ناداری خدا کا عذاب ہے۔ ایمان اور اعمال صالح کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں رزق کی فراخی، عزت اور سرفرازی کی زندگی (اور آخرت میں مقامات کی رفعت اور بلندی) ہے۔ قرآن ایک ایسا معاشی نظام پیش کرتا ہے جس میں دنیا اور آخرت دونوں میں حیاتِ طیبہ (خوشگوار زندگی) نصیب ہو جاتی ہے —— لیکن ہمارا مذہبی پیشواؤں کا طبقہ جو صدیوں سے قوم کو یہ سبق پڑھاتے چلا آ رہا ہے کہ مفلسی اور غریبی، ذلت اور رسوائی، مقربین بارگاہِ خداوندی کی علامت ہے اور مذہب کا کام انسان کی عاقبت سنوارنا ہے۔ اسے دنیا کے دھندوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ طلوعِ اسلام کی طرف سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ اس نے مذہب کو معاش کا مسئلہ بنا کر اس کی قدر و قیمت گھٹا دی ہے۔

راولپنڈی سے ایک اہم رسالہ شائع ہوتا ہے "تعلیم القرآن" اس کی جنوری ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں ایک مصری عالم، استاد محمد غزالی کے ایک مضمون کا ترجمہ شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ اسلام میں معاشی بحث کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ ذیل میں ہم اس مضمون کو ماہنامہ موصوف کے شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ محترم مقالہ نگار کے خیالات ہمارے لئے سند ہیں (ہمارے لئے سند تو خدا کی کتاب ہے) بلکہ اس لئے کہ فروعات کو چھوڑ کر جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے، وہ قرآن کی تعلیم کے مطابق ہے اور ان لوگوں کے لئے غور و فکر کا موجب، جو مصری علماء کو دین کے معاملہ میں سند سمجھتے ہیں۔

ہم چاہتے تھے کہ اصل مضمون مل جائے تو ہم خود اس کا ترجمہ کریں لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ اس لئے ہم اس ترجمہ پر (جیسا بھی ہے) اکتفا کرتے ہیں۔ اس میں ہم اپنی طرف سے کسی رد و بدل کو جائز نہیں سمجھتے کیونکہ اصل مضمون ہمارے سامنے نہیں۔

طلوعِ اسلام

وہ عقائد جو انسان کو نیک عمل، بلند خلق کی طرف لے جاتے ہیں۔ دین کا لب لباب ہیں۔ اور در حقیقت وہی دین اور تعلیمات دین کا محور ہیں۔ دین کو جس چیز کی اشد ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ دین کے عقائد پھیلانے اور ان کے عملی اور اخلاقی نتائج برآمد ہونے کے لئے ایک سازگار فضا ہاتھ آجائے۔ اگر ہم ایسی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو دین کے مقاصد پورے ہو جائیں گے۔ ورنہ تو پھر دین محض سامان تجارت کے مانند ہوگا جو کتابوں کی صورت میں لوگوں پر فروخت ہوگا۔ یا ایک بات بنی جس کو ایک گروہ لوگوں کے سامنے نقل کرتا رہے گا۔ اس صورت میں دین زندگی کے ایک حاشیہ ہی میں رہے گا۔

مجھے متعدد تجربوں کے بعد بارہا ایسے بدبخت طبقوں میں بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے جن میں بلند عقائد نیک اعمال اور اچھے اخلاق ہونے کے لئے میں کوئی معقول نشانہ پا سکا۔ در حقیقت یہ بات ممکن ہی نہیں کہ ایک انسان جس کا پیٹ تو خالی ہو مگر اس کا دل نور ہدایت سے بھر جائے یا اس کا بدن تو ننگا ہو مگر وہ لباس تقویٰ سے مزین ہو جائے۔

سب سے اشد ضرورت اس کی ہے کہ وہ ضروریات زندگی کی جانب سے بے فکر ہو تب اس سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد اس کے دل میں جاگزیں ہو جائیں گے۔

مجھے بارہا ایسے خاندانوں میں بھی وعظ کہنے کا اتفاق ہوا ہے جس کو مسکینی، جہالت اور قرضوں نے روند ڈالا تھا سو میں حیران تھا کہ میں انھیں کیا کہوں۔ کیا میں بھی ان کے سامنے دنیا کی قباحت بیان کروں جس طرح عام علمائے دین اور واعظین کرام کی روش ہے؟ حالانکہ ان کے دل میں دنیا کی جو قدر و منزلت ہے اس کی بنا پر وہ ان کی نظروں میں قبیح نہیں ہو سکتی۔ در حقیقت ان لوگوں کی ضرورت و احتیاج اس شخص کی طرف زیادہ ہے جو ان کو دنیا کے ارکان و اصول سمجھا دے بہ نسبت اس کے کہ جو ان کو دین کے ارکان سمجھائے۔ جبکہ ان کی اکثریت نہ تو زراعت کے جدید طریقوں سے واقف ہے اور نہ ہی صنعت کے نئے طریقے جانتی ہے تو وہ اپنے بھائیوں کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے اور اپنے حاکموں کو کیا پہنچائیں گے۔ کیا میں ان کو اللہ کی معرفت کی تعلیم دوں۔ حالانکہ اللہ کی معرفت تب ہی حاصل ہو سکتی ہے جب کہ ایک انسان اپنے نفس کا عارف ہو مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ (جس کسی نے اپنے نفس کو پہچان لیا سو اس نے اپنے رب کو پہچان لیا) اور یہ بدبخت تو اپنے آپ ہی کو بھولے ہوئے ہیں۔ اپنی موجودہ بدحالی ہی میں سرگرداں ہیں۔ در حقیقت اپنی حرماں نصیبی اور ذلت کے شعور نے ان کی قوت فکر کو شل کر دیا ہے۔ سو وہ اپنے رب کی معرفت کس طرح حاصل کریں؟ جب وہ اپنے دن رات کا حساب ہی نہیں چکا سکتے تو روز محشر کے حساب کے لئے کیسے تیار ہو سکتے ہیں۔ میں اس کا منکر نہیں کہ دنیا میں بعض ایسی غربت و افلاس کی وجہ سے سوکھی گردنیں بھی ہیں جن کے اس طرف ایسے دل ہیں جو قوت ایمانیہ سے لبریز ہیں لیکن ان کی قدر و قیمت کچھ بھی نہیں۔ اور یہ دل صاحب دل کو دنیا و آخرت کا کوئی معتدبہ نفع نہیں پہنچا سکتے۔

ایسی تنگ فضا میں دین کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی ایسے مفلوج خاندانوں میں دین کے عقائد پائدار ہو سکتے ہیں۔ سب سے پہلے ضروری ہے کہ وسیع پیمانے پر اقتصادی اصلاحات کی جائیں اور عمرانی اصلاح کی جائے۔ اگر ہم فی الواقع

دین کے نام معاصی اور رذائل کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ یا لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف پھیرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر ہم اس اصل سبب کو اپنی جگہ پر ہی چھوڑ دیں، جس سے در حقیقت جرائم یا رذائل پیدا ہوتے ہیں اور بڑھتے ہیں اور دین کی خدمت صرف نصائح اور جذبات ابھارنے سے کریں تو یہ ایک عبث فعل ہوگا۔

میں ادبی کام کا انکار بھی نہیں کرتا اور نہ ہی تمام انسانیت کی ضمیر کو مردہ سمجھتا ہوں ــــ فی الحقیقت ایسے حالات بھی پائے جاتے ہیں کہ ایک انسان ہلاکت کے گڑھے پر ہوتا ہے۔ اس وقت اس کو دنیاوی مجبوریاں اور حرماں نصیبی اس کو برائی پر سخت مجبور کرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ برائی سے منہ پھیر لیتا ہے اور اس کے ضمیر کی قوت اس کی مدد کرتی ہے لیکن ایسے حالات کی توقع تمام انسانیت سے کرنا فضول ہے۔ بلکہ ایک انسان سے بھی اس کی پوری زندگی میں ایسے حالات اور شاذ و نادر ہی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اگرچہ وہ بڑا فاضل اور عالم ہی کیوں نہ ہو۔

تو ہمارے لئے بہتر یہی ہے کہ ہم دنیا کے واقعات اور حقائق کا اعتراف کریں اور مان لیں کہ اخلاقِ رذیلہ کا زیادہ حصہ مرض مسکینی اور جہالت ہی کی پیداوار ہے اور یہ بات یقینی ہے کہ ان انسانی مصائب کے دور ہو جانے سے جرائم کی رفتار نوے فیصدی کم ہو سکتی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ مصر میں ہزاروں علماء ہیں جو کہ دین کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ مدارس دینیہ اور مساجد ہیں پھیلے ہوئے ہیں جو شہروں اور دیہاتوں میں جاتے ہیں اور وعظ و تبلیغ کرتے ہیں۔ تو کیا اس مادی اور ادبی جدوجہد کے باوجود ہم یورپ کی ایک معمولی ریاست جیسی اخلاقی ترقی اور اجتماعی امن کے حصول میں کامیاب ہو سکے ہیں؟ ہرگز نہیں ہمارے ہاں اور ان کے ہاں کے جرائم کے اعداد و شمار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہزاروں دیوانی و فوجداری مقدمات ہماری عدالتوں کے زیرِ سماعت ہیں اور ان کا حقیقی سبب یہی ہے کہ ادب اور دولت دونوں کے عدم توازن نے شیطان کی کامیابی کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ اب اگر دین اپنی بقا چاہتا ہے تو اس کو ان حالات کی تبدیلی میں ضرور حصہ لینا ہوگا ورنہ دین کا اصلی مقصد حاصل نہ ہوگا۔ بلکہ اس بدترین اور منکر صورتِ حال کو دین برداشت نہیں کر سکتا اور اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ دین اپنے آپ کو بھول جائے، سر جھکا لے اور خود ہی اپنی قبر کھود لے۔ اب ہم بعض عام جرائم کی مثالیں دیتے ہیں جن سے ہمارے مدعا کی اچھی وضاحت ہو جائے گی۔

چوری یہ ایک اخلاقی اور بڑا اجتماعی جرم ہے۔ اگر پوشیدہ اس کا ارتکاب کیا جائے تو اس کی سزا شریعت میں قطع ید ہے لیکن اگر جبراً اور ڈاکہ زنی یا راہزنی کے طور پر ہو تو سزائے موت ہے۔ اگر اس کی سزا دینے سے مقصد حقوق کی حفاظت اور امن عامہ کا قیام ہو یا لوگوں کو حلال طریقے پر کسب معاش کی طرف متوجہ کرنا ہو تو اس میں کوئی سختی یا سنگدلی نہیں ہے۔

اگر کسی جرم کے بارے میں ایسے شبہات پیدا ہو جائیں کہ اس پر دی جانے والی سزا سے وہ اغراض و مقاصد پورے نہ ہوتے ہوں جو مطلوب ہیں تو اس صورت میں سزا کا موقوف کر دینا لازمی ہوتا ہے۔ اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کہ الحدود تندرأ بالشبہات (حدود شبہات پیدا ہونے سے ساقط ہو جاتے ہیں) اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قحط کے زمانے میں حد کو معطل کرنے کا حکم فرمایا تھا اور ائمہ فقہاء رحمہم اللہ نے فرمایا کہ اگر سارق مال مسروقہ پر ملکیت کا دعویٰ کر دے تو اگر ملکیت کا شبہ قابل قبول ہو تو حد ساقط ہو جاتی ہے ۔۔۔ تو اس قدر احتیاط کرنے سے شارع کا مقصد یہی تو ہے کہ صرف ظالم اور چور ہی کا ہاتھ کاٹا جائے۔ یعنی ایسے چور کا ہاتھ کاٹا جائے کہ وہ اپنے پاس وجہ کفاف رکھتے ہوئے بھی چوری کا ارتکاب کرے اور ایک عادی مجرم ہو اور اس قسم کے مجرم درحقیقت تھوڑے ہی ہوتے ہیں بلکہ ان ہزاروں مجرموں سے جو آئے دن عدالتوں میں پیش کئے جاتے ہیں اس قسم کے عادی چور چند گنے چنے ہیں اور انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

ہمارے اس ملک میں بھی ایک اجتماعی خرابی اور فساد عظیم ہے جس نے ہزارہا ایسے انسانوں کے دامن کو چوری سے داغدار کر دیا ہے جن کا چور بننا بعید از امکان تھا۔ اگر یہ اجتماعی فساد نہ ہو تو بغیر قطع ید اور گردن زدنی، ایک صالح معاشرہ کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔ جس میں جرائم کی تعداد کافی حد تک کم ہو جائے۔ لیکن یہ تب ہی ہو سکتا ہے جبکہ ان نفسیاتی اضافی اسباب کا قلع قمع کر دیا جائے جو اغلب اوقات ایک انسان کو چور بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

جب کاروبار کے متعدد دروازے کھل جائیں ۔۔۔ جب کمائی کے ذرائع پر کنٹرول کر دیا جائے ۔۔۔ جب ملکیت کی مقدار کی حد مقرر کر دی جائے ۔۔۔ جب لوازم حیات اور لوازم علم قوم کے بدبخت اور فلاکت زدہ طبقات کی طرف راہ پالیں ۔۔۔ اور جب دولت مند اور اہل ثروت، بیکار اور معطل طبقے کو کام اور محنت پر مجبور کیا جائے اور ان کے سرمائے ایسے کاموں میں لگائے جائیں جن سے وہ خود بھی فائدہ اٹھائیں اور دوسرے لوگ بھی فائدہ اٹھائیں تب کہیں جا کر چوری کم ہوگی اور چور اس کے مستحق ہوں گے کہ ان کے ہاتھ اور اگر باز نہ آئیں تو پھر پاؤں کاٹے جائیں۔

زنا یہ بھی اخلاقی اور انتہائی وحشی اخلاقی و اجتماعی جرم ہے۔ اس جرم کے پھیلنے کا سب سے بڑا سبب بھی معیشت کا عدم توازن ہے جو کہ معاشرے میں ایک امیر سے امیر طبقہ پیدا کرتا ہے۔ اور ایک غریب سے غریب تر اور فلاکت زدہ ۔۔۔ یہاں تک کہ موجودہ قانون نے اس کے ارتکاب کو اور وقت ارتکاب اور جس سے اس کا ارتکاب کیا جائے باقاعدہ رجسٹر کر دیا ہے۔ بدکاری کے بازار علی الاعلان جائز قرار دیدیئے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ بدکاری کی محفلیں اونچے اور ادنیٰ دونوں طبقوں میں امور معتادہ میں سے بن گئی ہیں ۔۔۔ اور ہم صاف دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ اسلام پسند طبقہ کی چیخ و پکار کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ تو اس جرم کا قلع قمع اور اس مشکل کا حل صرف خشک زجر و توبیخ سے نہیں ہو سکتا۔ ایک عادی واعظ کے لئے خشک وعظ کر دینا بہت آسان ہے مگر اس کا اثر معاشرے پر بہت قلیل ہوتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ جنسی شہوت لازمی طور پر متحرک ہوتی ہے تو اگر اس نفسانی خواہش کے قضا کے لئے کوئی جائز صورت نہ ہوئی تو ظاہر ہے کہ اس فطری جذبے کے پورا ہونے کے لئے حرام راہ کے سوا اور کوئی سبیل نہ ہوگی۔

پھر ایک ایسا قانون بنانے وقت جس سے مقصد پوری قوم کی عصمت کی حفاظت اور پوری قوم کے نوجوانوں کی

مادی اور ادبی اور عقلی قوتوں کی صیانت ہو۔ قوم میں سے ان چند گنے چنے فضلاء اور مطمئن لوگوں کی وقتی یا دائمی عصمت کو مدنظر نہیں رکھا جاتا۔ تو اگر ہم درحقیقت خلوص کے ساتھ دین کے نام سے جنسی شہوت پرستی کی جنبش حرکت کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ ہم جائز اتصال کے مواقع کو زیادہ سے زیادہ آسان اور زیادہ سے زیادہ منظم کر دیں۔ اور اس مشکل اور پیچیدہ مسئلہ کو صحیح اور سائنٹیفک بنیادوں پر حل کریں اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم شادی کے فطری حقائق پر غور کریں اور موجودہ صورت حال میں شادی جن مشکلات سے دوچار ہو کر طے پاتی ہے، ان کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

درحقیقت غریب اور متوسط طبقہ کو شادی کے وقت تین طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اول مہر کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہوتا ہے تاہم اس کا طے کرنا کسی قدر آسان ہے۔ دوسرا ذریعۂ معاش اور وسائل آمدن جس سے زوجین کی زندگی باسانی بسر ہو سکے اور ان کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ تیسری یہ کہ متاہل ہو جانے کی صورت میں وہ کون سے ذرائع ہوں گے جن سے اولاد کی زندگی بسر ہو گی اور ان کی خاطر خواہ تربیت ہو سکے گی۔ یہ سب مشکلات معاشی اور اقتصادی ہیں جن کا حل دین اور اہل دین کے لئے صرف باتوں ہی باتوں سے کر دینا انتہائی مشکل ہے۔ بلکہ ناممکن ہے۔ دین اس مسئلہ کو تب ہی حل کر سکتا ہے جب کہ دین ایک ایسا معاشرہ قائم کر دے جس میں کوئی حقیر و فقیر نہ ہو۔ ایسا معاشرہ جو ایک فرد کو اس کے مستقبل اور اس کے خاندان کی نگہداشت کی معقول ضمانت دے ایسا معاشرہ جہاں پوری قوم کی کمائی کو پوری قوم کی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کیا جاتا ہو، صرف چند افراد کے تعیش کے لئے پوری قوم کی کمائی تباہ نہ کی جاتی ہو۔ جونہی یہ کام ہو گیا تو زنا کے مقدمات کی بڑی تعداد کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اور اگر ارباب تعیش کے عیش و عشرت کے اسباب کو ختم کر دیا جائے تو فسق و فجور اور غلامی و اباحیت کے ایک بڑے حصے کا خود بخود فیصلہ ہو جائے گا۔ اگر اس کے بعد بھی۔ جب کہ معاشرہ نے جائز ذرائع فراہم کر دیئے ہوں کوئی زنا کا ارتکاب کرے تو اس کو کوڑوں کی سزا دینا اور رجم کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

بیکاری

یہ بھی ایک اخلاقی اور اجتماعی جرم ہے اور اس کے پھیل جانے سے قوموں کو بڑے نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ شریعت اسلامیہ میں بے کار رہنے سے منع کیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ ہر آدمی کوئی ایسا کام ضرور کرے جس سے اس کی ضروریات زندگی پوری ہو سکیں، اس کی زندگی گذر سکے اور اس کی عزت محفوظ رہے۔ بیکاری دو قسم کی ہے۔ ایک تو ان عیش پرستوں کی بے کاری اور آرام طلبی ہے جو سونے اور چاندی کے ڈھیروں کے مالک ہیں۔ ان لوگوں کی بے کاری اور آرام طلبی کے مضرات اور ان کی عدم مشغولیت کی وجہ سے قوم پر جو مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں ان کی طرف ہم ابھی اشارہ کر چکے ہیں۔ چونکہ فساد کے دروازوں کا بند کرنا ضروری ہے۔ اس لئے ان بیوقوفوں کی دولت پر اور ان کی شخصی آزادی پر پابندی لگانا اشد ضروری ہے تاکہ یہ لوگ بھی کام کرنے والے اور کمانے والے بن جائیں۔ اور ان کی ذخیرہ کردہ دولت و ثروت خود ان کے لئے اور باقی غرباء کے لئے مفید ثابت ہو سکے۔ اور تعطل اور بے کاری کی ایک قسم یہ بھی ہے جو ہزارہا افراد میں پھیلی ہوئی ہے اور اسی بے کاری سے بھیک، لاقانونیت، فساد اور عداوتوں جیسے جرائم پیدا ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو یقیناً باعزت روزگار

(باقی صفحہ [illegible] پر)

حقائق و عبر

۱۔ ولادت حضرت امام مہدی

ہفت روزہ معاصر "شہاب ثاقب" (پشاور) کی ۱۶ فروری ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں "مولانا سید منظور حسین صاحب قبلہ خطیب جامع مسجد حاجی لاہور" کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں "حالات ولادت باسعادت حضرت امام مہدی آخرالزماں" درج ہیں۔ چونکہ قارئین طلوع اسلام کو شیعہ حضرات کے عقائد و خیالات اور ائمہ کرامؑ کے احوال و کوائف سے مستفید ہونے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ اس لئے ہم ان کی معلومات میں اضافہ کے لئے مذکورہ صدر مقالہ کا وہ حصہ جو ولادت امام موصوف سے متعلق ہے۔ درج ذیل کرتے ہیں۔

"بنابر روایات معتبرہ مشہورہ حضور صاحب الزماں کی ولادت باسعادت پندرھویں ماہ شعبان بروز جمعۃ المبارک بوقت صبح صادق ۲۵۵ھ ہجری میں ہوئی ہے۔ واقعہ ولادت اس طرح مرقوم ہے کہ جناب حکیمہ خاتون دختر حضرت امام محمد تقی علیہ السلام فرماتی ہیں کہ جب میرے بھائی امام علی نقی علیہ السلام نے رحلت فرمائی اور جناب حسن عسکری علیہ السلام درجۂ امامت پر فائز ہوئے تو میں بموافق عادت اپنے بھتیجے کے پاس جایا کرتی تھی۔ ایک روز جو میں امام حسن عسکریؑ کے ہاں گئی تو حضرت نے فرمایا۔

اے پھوپھی اماں آج شب یہیں رہ جاؤ کہ میرے یہاں وہ فرزند گرامی قدر متولد ہونے والا ہے جس سے خداوند عالم زمین کو ایمان و ہدایت سے معمور کر دے گا۔"

حکیمہ خاتون نے فرمایا کہ اے مولا کونسی خاتون سے یہ بچہ پیدا ہوگا۔ آپ نے فرمایا نرجس خاتون سے۔ پس حکیمہ خاتون نے نرجس خاتون کو گلے لگایا اور اسے تہنیت و مبارکباد دی کہ آج آپ کے ہاں ایسا فرزند پیدا ہوگا جو دنیا اور آخرت میں سید و سردار ہے۔ اس کے بعد حکیمہ خاتون نے امام علیہ السلام سے عرض کی کہ میں نے نرجس خاتون میں حمل کی کوئی علامت نہیں دیکھی۔

امام مسکرائے اور فرمایا اے پھوپی اماں ہم شکمِ مادر میں نہیں اٹھائے جاتے بلکہ ہم کو پہلو میں حمل کیا جاتا ہے۔ ہم اولیاءِ الٰہیہ ہیں اور نجاسات سے ملوث نہیں ہوتے۔ اور جب صبح صادق نمودار ہوگی تو ظاہر ہوگا۔ ان کا دل با مدد یاد کرے گا۔ کے سبب کہ ہنگام ولادت تک کسی طرح کا تغیر ان پر ظاہر نہ ہوا اور کوئی شخص ان کے حالِ حمل سے مطلع نہ ہوا۔

جنابِ حکیمہ خاتون فرماتی ہیں کہ میں جب نمازِ شب پڑھ کر مصروفِ دعا ہوئی تو نرجس خاتون نے بھی وضو کیا، اور نمازِ شب پڑھی، اور اوراد و وظائف سے فارغ ہونے تک کوئی اثر نرجس خاتون میں نہ پایا۔ صبح کاذب کا وقت ہونے کو تھا کہ میرے دل میں شک گزرا، ناگاہ امامؑ نے معجزہ سے معلوم کر لیا۔ اور صدا دی۔ اے پھوپی اماں... شک نہ کرو اب وقت قریب آگیا ہے۔ اور اسی وقت نرجس خاتون کو ایک اضطراب پیدا ہوا۔ میں اسمائے الٰہی پڑھ کر دم کرنے لگی۔ حضرت نے فرمایا سورۂ "انا انزلنا" پڑھو۔ جب میں نے سورہ شروع کیا۔ لڑکا بھی اپنے ماں کے بطن سے سورہ پڑھنے لگا۔ میں خائف ہوئی۔ اتنے میں نرجس خاتون میری آنکھوں سے غائب ہوگئیں۔ میں فریاد کرتی ہوئی حضرت کے پاس گئی۔ آپ نے فرمایا کچھ فکر نہ کیجئے۔ وہیں جائیے۔ جب میں پھر واپس آئی تو نرجس خاتون کو موجود پایا۔ اور اس وقت ان کے چہرے پر ایسا نور تھا کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں اور وہ مولودِ مسعود و موجود یعنی آفتابِ امامت بوقتِ صبح صادق طلوع ہوا۔ یعنی ایک طفل رو بقبلہ سجدۂ خدا میں ہے۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا تو وہ ناف بریدہ، طاہر و مطہر اور مختون تھا۔ اور انگشتِ شہادت آسمان کی طرف بلند کر کے پڑھ رہا تھا۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ جَدِّيْ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ اَبِيْ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ اس کے بعد ہر ایک امام کا نام لیتے رہے جب اپنے نام پہنچے تو فرمایا

اَللّٰهُمَّ اَنْجِزْ لِيْ مَا وَعَدْتَنِيْ وَاَتْمِمْ لِيْ اَمْرِيْ وَثَبِّتْ وَطْاَتِيْ وَامْلَاْءِ الْاَرْضَ بِيْ قِسْطًا وَعَدْلًا۔

"بارالہا! جو تو نے نصرت کا وعدہ میرے ساتھ کیا ہے اس کو وفا فرما، اور میرے امرِ خلافت و امامت کو تمام کر اور میرے سبب سے زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے"

پھر امام نے فرمایا اے پھوپی اماں میرے بیٹے کو میرے پاس لاؤ۔ حکیمہ خاتون کہتی ہیں کہ جب میں نے اسے گود میں لیا۔ تو دیکھتی ہوں کہ اس کے داہنے ہاتھ پر کلکِ قدرت سے تحریر ہے۔ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۔ "حق آگیا اور باطل زائل ہوگیا۔ یقیناً باطل زائل ہونے والا ہے"

۲۔ احادیث لکھی کیوں نہ گئیں؟

احادیث کے سلسلہ میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دین کا جزو تھیں اور امت نے قیامت تک ان کے مطابق عمل کرنا تھا تو نبی اکرمؐ کا بہ حیثیت رسول اللہ یہ فریضہ تھا کہ آپ اپنی احادیثِ مقدسہ کو اسی طرح جمع و مرتب فرما کر امت کو دے جاتے

جس طرح حضورؐ نے امت کو قرآن دیا تھا۔ واضح رہے کہ حضورؐ نے قرآن کریم کو اسی شکل میں جمع و مرتب فرما کر امت کو دیا تھا جس شکل میں وہ امت کے پاس موجود ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ قرآن بعد میں جمع اور مرتب ہوا تھا۔ اس اہم سوال کا کوئی اطمینان بخش جواب آج تک نہیں مل سکا۔ جماعت اسلامی والوں کی طرف سے یہ جواب ملا تھا کہ چونکہ اس زمانے میں سامانِ کتابت کی کمی تھی، اس لئے حضورؐ نے احادیث کو لکھوا کر نہیں دیا تھا۔ اس جواب کا جو وزن ہے وہ ارباب علم و بصیرت سے پوشیدہ نہیں)۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب (پیرس) کا تعارف اس سے پہلے انہی صفحات میں ہو چکا ہے۔ وہ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ

> نبی اکرمؐ بحیثیت انسان اپنے افعال میں محتاط اور (MODEST) تھے۔ بحیثیت رسولِ خدا انہوں نے اس امر کے لئے ہر ممکن اور ضروری اقدامات کر لئے تھے کہ خدا کا پیغام یعنی قرآن نہ صرف لوگوں تک پہنچا دیا جائے بلکہ اسے محفوظ بھی کر دیا جائے۔ اگر وہ اپنے قول کی حفاظت کے لئے بھی اسی قسم کے اقدامات کرتے تو بعض لوگ اسے انانیت پر محمول کرتے۔ اس وجہ سے حدیث کی کہانی قرآن سے مختلف ہے۔
>
> (ترجمہ از الاسلام۔ کراچی۔ مورخہ یکم و پندرہ جنوری ۱۹۵۹ء)

یعنی ڈاکٹر صاحب کے خیال کے مطابق، رسول اللہ نے اپنی احادیث کو اس لئے منضبط نہیں کرایا تھا کہ کہیں لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ شخص اپنی باتوں کو اس قدر اہمیت دیتا ہے۔ (ڈاکٹر صاحب کے الفاظ یہ ہیں

> Had he taken the same steps for the preservation of his own sayings, he would have been considered by some as an egoist.

آپ اس خیال سے قطع نظر کر لیجئے کہ ہم حدیث کی صحیح پوزیشن کیا سمجھتے ہیں اور یہ حضرات اس کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں، دیکھئے صرف یہ کہ ان حضرات کے اس قسم کے خیالات کی روشنی میں خود نبی اکرمؐ کی ذات گرامی کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ حضورؐ کا فریضہ یہ تھا کہ دین کی ہر بات کو امت تک پہنچا لیں اور چونکہ یہ آخری دین اور آپ خدا کے آخری رسول تھے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ جن امور سے دین عبارت تھا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھے جاتے لیکن ان حضرات کا کہنا ہے کہ حضورؐ نے دین کے ایک اہم حصے کو اس لئے محفوظ نہ کرایا کہ اس سے لوگ آپؐ کو (EGOIST) کہیں گے۔ یعنی حضورؐ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) لوگوں کی اس قسم کی باتوں کے خیال سے دین کے ایک ایسے اہم فریضہ کی ادائیگی سے قاصر رہے۔

یہ ہیں وہ حضرات جو یورپ میں بیٹھے تبلیغِ دین کا فریضہ ادا فرما رہے ہیں! ایسے دوستوں کی موجودگی میں دین کو کسے دشمن کی ضرورت باقی رہ سکتی ہے؟

۳۔ موسیقی کے متعلق فتوے

ہفتہ وار صدق جدید (لکھنؤ) کی ۲۷ فروری ۱۹۵۹ء کی اشاعت (کے باب المراسلات) میں ایک صاحب نے موسیقی اور مزامیر کے جواز اور عدم جواز کے متعلق چند سوالات کئے ہیں۔ جن کے جواب میں صدق نے حسب ذیل نوٹ لکھا ہے۔

مراسلہ نگار بالآخر جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہی صحیح ہے۔ افراط و تفریط سے پاک۔ گانا بجانا جیسا کہ وہ مروج ہے شریعت اسلامی کے مزاج میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔ وہ صرف مخرب اخلاق قسم کے لہو و لعب میں آتا ہے اور بطور پیشہ اور فن کے اس کو استعمال کرنا تو بالکل ہی ناجائز ہے۔

البتہ جہاں مقصود محض اپنی تفریح اور دل بہلاؤ ہو اور جو اخلاقی خرابیوں سے خالی ہو۔ یا شادی وغیرہ کے موقع پر محض وقتی طور پر ہو ایسی صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بہ قول مراسلہ نگار صاحب کے یہ موقع توسع اور چشم پوشی کے ہیں۔

باجوں (مزامیر) میں دف کے مستثنیٰ کرنے کے کوئی معنی نہیں۔ ملک کا ہر سادہ مروج باجہ اس کے ذیل میں آسکتا ہے۔ البتہ باجوں میں بھی وہی احتیاط چاہیئے۔ جو باجہ جتنا زیادہ سادہ ہوگا۔ اباحت کے قریب ہوگا۔ اور جو جتنا زیادہ مقتضیات فن صناعت کے لحاظ سے آراستہ و پیراستہ ہو اتنا ہی حدود اباحت سے دور ہوتا جائے گا۔

طلوع اسلام۔ اس ضمن میں دو ایک باتیں غور طلب ہیں۔ سب سے پہلے یہ پوچھنے والے ان حضرات سے یہ پوچھتے ہیں کہ فلاں بات کے متعلق اسلام کا کیا حکم ہے؟ اس کے جواب میں کہنا یہ چاہیئے کہ اس باب میں خدا کا یہ حکم ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات اپنے جوابات میں کہیں خدا کے حکم کا ذکر نہیں کریں گے۔ ہمیشہ یہ کہیں گے کہ فلاں چیز جائز ہے اور فلاں ناجائز ہے۔ سوال یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا کیا حق حاصل ہے کہ وہ اشیاء کے جائز و ناجائز ہونے کے فیصلے کرے اور اس طرح لوگوں کو اپنے فیصلوں کا پابند بنائے؟ نہ صرف یہ بلکہ اپنے فیصلوں کو اسلام کا فیصلہ اور دین کا حکم قرار دے۔ جس خدا نے انسانوں کے لئے اسلام کو بطور دین تجویز کیا تھا اسی نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰) "جس بات میں تمہیں اختلاف ہو اس میں فیصلہ کن حکم خدا کا ہوگا"

دوسری چیز خود اس "فتویٰ" سے متعلق ہے جسے محترم مدیر صدق نے صادر فرمایا ہے۔ یعنی یہ کہ

جو باجہ جتنا زیادہ سادہ ہوگا اباحت کے قریب ہوگا اور جو جتنا زیادہ مقتضیات فن صناعت کے لحاظ سے آراستہ و پیراستہ اتنا ہی حدود اباحت سے دور ہوتا جائے گا۔

ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ اس مجتہدانہ بلندیٔ فکر و نظر کی داد کن الفاظ میں دی جائے؟ یعنی اس اجتہادی اصول کی داد کہ اگر کوئی شے سادہ شکل میں ہو تو اس کا استعمال جائز ہوگا اور اگر اس میں فنی باریکیاں پیدا ہو جائیں تو وہ ناجائز ہو جائے گی۔

مثال کے طور پر گدھے کی سواری جائز ہوگی اور ہوائی جہاز کی ناجائز۔ دودھ میں شکر ملا کر پی لیا جائے تو جائز اور ان دونوں کے امتزاج سے قلاقند بنا لیا جائے تو ناجائز۔ لٹھے کا تہبند باندھ لیا جائے تو جائز اور اگر تھوڑی سی صناعی سے اس کا پاجامہ بنا لیا جائے تو ناجائز۔ اور پتلون یکسر حرام کیونکہ اس میں صنعت کاری پاجامہ سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے!

اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ ان حضرات کے نزدیک فقہ کے اصول کس طرح متعین ہوتے ہیں اور ان اصولوں کی روشنی میں جائز و ناجائز کے فیصلے کس طرح! اسے بھی پیش نظر رکھئے کہ یہی حضرات ہماری آنے والی نسلوں کے لئے اسلاف بن جائیں گے۔ اور ان کے فیصلوں کو فقہائے سلف کے فیصلے قرار دے کر شریعت میں بطور سند پیش کیا جائے گا۔

۴۔ اہل حدیث اور اہل قرآن

فرقہ اہل حدیث اور فرقہ اہل قرآن سے متعلق حضرات کی باہمی چپقلش بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ اہل حدیث حضرات کا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم صرف قرآن کو مانیں اور حدیث کو نہ مانیں تو بتائیے کہ ہم نماز کیسے پڑھیں کیونکہ قرآن میں نماز کی تفاصیل درج نہیں ہیں۔ اس کے جواب میں اہل قرآن حضرات کہتے ہیں کہ آپ یہ فرمائیے کہ احادیث کی موجودگی میں ہم نماز کس طرح پڑھیں کیونکہ احادیث سے نماز کی کوئی ایک شکل متعین نہیں ہوتی۔ پوری نماز کی ایک شکل تو کجا، ایک ایک تفصیل کے لئے اختلافی احادیث ملتی ہیں۔

ہمیں ایک مختصر سا پمفلٹ موصول ہوا ہے جس کا عنوان ہے "نماز"۔ لکھنے والے ہیں "فیض رحمانی" صاحب اور شائع ہوا ہے مکتبہ رحمانی بہاولپور سے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ صاحب کس فرقہ سے متعلق ہیں لیکن وہ شروع میں لکھتے ہیں کہ

> جاننا چاہیئے کہ اہل سنت والجماعت کا طریقۂ نماز عمل متواتر سے ثابت ہے اور قرآن حکیم و سنت صحیحہ سے تائید و تصدیق ہوتی ہے۔

لیکن اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ احادیث میں (جن کا سلسلہ جلیل القدر صحابہ اور واجب الاحترام صحابیات تک منتہی ہوتا ہے اور جن پر سب راوی ثقہ اور معتبر بیان کئے جاتے ہیں) نماز کے متعلق ایسی تفاصیل ملتی ہیں جو ایک دوسرے سے نہیں ملتیں۔ مثلاً

(۱) ترمذی میں روایت ہے رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے وقت شانوں تک ہاتھ اٹھاتے تھے۔ ابوداؤد میں روایت ہے رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے وقت کانوں کی لو تک ہاتھ اٹھاتے تھے۔

(۲) مسلم میں روایت ہے رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد نماز کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔ بخاری

میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد فاتحہ سے قبل اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ الخ دعا پڑھتے تھے۔ ابوداؤد میں روایت ہے رسول اللہ تکبیر تحریمہ کے بعد فاتحہ سے قبل اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھتے تھے۔ نسائی میں روایت ہے رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد فاتحہ سے قبل اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ الآیہ پڑھتے تھے۔ نسائی میں دوسری روایت ہے رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد فاتحہ سے قبل اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ الآیہ۔ ترمذی اور ابن ماجہ میں ہے روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد فاتحہ سے قبل سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ ثنا پڑھتے تھے۔

(۳) ترمذی۔ ابوداؤد۔ نسائی میں روایت ہے رسول اللہ صلعم نے صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھائے۔ کانوں تک پھر بار بار رفع یدین نہیں کیا ساری نماز میں۔ بخاری اور مسلم میں روایت ہے رسول اللہ صلعم نماز شروع کرنے کے وقت دونوں ہاتھ مونڈھوں تک اٹھاتے تھے اور رکوع کے بعد بھی رفع یدین کرتے تھے۔

(۴) سنن امام شافعیؒ اور مسند احمد بن حنبل میں روایت ہے رسول اللہ صلعم نماز میں بحالت قیام سینہ پر ہاتھ باندھتے تھے۔ موطا امام مالکؒ میں روایت ہے رسول اللہ صلعم ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے تھے۔

(۵) ترمذی۔ نسائی۔ ابوداؤد میں روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جس شخص کو قرآن میں سے کچھ بھی یاد نہ ہو وہ نماز میں صرف سبحان اللہ الحمد للہ اور لا الہ الا اللہ قیام میں پڑھ کر رکوع کرے۔ اس کے لئے یہی کافی ہے۔ موطا ابن ماجہ۔ بخاری۔ مسلم میں روایت ہے رسول اللہ نے فرمایا بغیر فاتحہ نماز ناقص ہے۔

(۶) موطا میں روایت ہے کہ نماز باجماعت میں امام کے پیچھے قرأت فاتحہ ناجائز ہے۔ خواہ نماز جہری ہو یا سری۔ موطا میں دوسری روایت ہے کہ نماز باجماعت میں امام کے پیچھے قرأت فاتحہ جہری نماز میں ممنوع ہے اور سری میں جائز ہے۔ بخاری ومسلم میں روایت ہے کہ نماز باجماعت میں امام کے پیچھے قرأت فاتحہ فرض ہے خواہ نماز جہری ہو یا سری۔

(۷) موطا میں روایت ہے آمین بالجہر ابتدائے اسلام میں تھا۔ پھر متروک ومنسوخ ہوا۔ ترمذی اور ابوداؤد میں روایت ہے کہ بعد فاتحہ آمین بالسر آہستہ کہنا چاہیئے۔ خواہ نماز باجماعت ہو یا تنہا۔ بخاری ومسلم میں روایت ہے کہ جہری نماز میں بعد فاتحہ آمین بالجہر اور سری نماز میں بالسر کہنا چاہیئے۔ خواہ جماعت ہو یا تنہا۔

(۸) بخاری میں روایت ہے رسول اللہ صلعم نے نماز کے قعدہ کے لئے یہ تشہد تعلیم فرمایا۔ اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ مسلم میں روایت ہے رسول اللہ صلعم نماز کے قعدہ کے لئے یہ تشہد سکھلاتے تھے۔ اَلتَّحِیَّاتُ الْمُبَارَکَاتُ الصَّلَوٰتُ الطَّیِّبَاتُ لِلّٰہِ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ نسائی میں روایت ہے رسول اللہ صلعم نے نماز کے قعدہ کے لئے یہ تشہد تعلیم فرمایا

بِسْمِ اللّٰہِ وَبِاللّٰہِ التَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ الطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ۔ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اَسْئَلُ اللّٰہَ الْجَنَّۃَ وَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ النَّارِ۔ موطا میں روایت ہے عبداللہ بن عمرؓ یہ تشہد قعدہ میں پڑھتے تھے۔ بِسْمِ اللّٰہِ التَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ الصَّلَوَاتُ لِلّٰہِ الزَّاکِیَاتُ لِلّٰہِ اَلسَّلَامُ عَلَی النَّبِیِّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ۔ شَھِدْتُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ شَھِدْتُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ موطا میں تیسری روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نماز کے قعدہ میں یہ تشہد پڑھتی تھیں اَلتَّحِیَّاتُ الطَّیِّبَاتُ الصَّلَوَاتُ الزَّاکِیَاتُ لِلّٰہِ اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ۔"

ان اختلافی روایات کو نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

اب کون فیصلہ کرے کہ ان مختلف روایتوں میں صحیح کیا ہے۔ راویوں کی جرح و تعدیل اور سلسلۂ سند کے اتصال وغیرہ پر بحث کرنے کی بجائے ان روایتوں کو قرآن کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔

ان روایتوں کو قرآن حکیم کی روشنی میں کس طرح دیکھا گیا ہے۔ اس کا اندازہ حسب ذیل مثال سے لگایئے۔ وہ فرماتے ہیں۔

'قرآن حکیم میں ارکان و اذکار نماز کی آیات بھی ملتی ہیں۔ جن سے احادیث شریفہ کی تصحیح ہو سکتی ہے۔ جو روایات قرآنی آیات کے خلاف مروی ہیں وہ سب یقیناً وضعی ہیں۔ مثلاً نماز کے قیام میں ہاتھ چھوڑ کر کھڑے ہونے یا زیر ناف ہاتھ باندھنے کی روایات قرآنی ہدایت کے خلاف ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا تھا گریبان میں ہاتھ ڈالو۔ "اُسْلُکْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ" اس کے ساتھ ہی یہ حکم بھی تھا کہ ایک ہاتھ سے دوسرے کو پکڑو۔ "وَاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھْبِ" سینہ پر اس طرح ہاتھ باندھو کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ پکڑے رہو باادب ہو کر۔

آپ نے غور فرمایا کہ "نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے" کی تائید کون سی آیت قرآنی سے حاصل کی گئی ہے؟ اس آیت سے جس کا صلوٰۃ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ سورۂ قصص کی آیت ہے جس میں حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ہے کہ اُسْلُکْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ۔ وَّاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھْبِ فَذٰنِکَ بُرْھَانٰنِ مِنْ رَّبِّکَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَائِہٖ۔ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ (۲۸/۳۲) اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔ "اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال۔ وہ بغیر کسی عیب کے سفید ہو کر نکلے گا۔ اور خوف میں اپنا بازو اپنی طرف ملا لے یہ دو روشن دلیلیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف ہیں۔ وہ نافرمان لوگ ہیں۔" اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا کہ خدا نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ نماز میں ہاتھ سینہ پر باندھا کرو (معاف فرمائیے) قرآن سے دل لگی کرنا ہے۔

(یہ دلیل بالعموم فرقہ اہل قرآن کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ اور اگر ہم غلطی نہیں کرتے تو مولانا عبداللہ چکڑالوی مرحوم نے اسی کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔)

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو قرآن کریم نے صلوٰۃ کی ان تفاصیل کا ذکر کیا ہے۔ اور نہ ہی نماز کی کوئی واحد شکل احادیث کی رو سے متعین ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو ہمارے مختلف فرقوں میں نماز کی تفاصیل میں اختلاف کیوں ہوتا درآنحالیکہ تمام فرقے اپنی اپنی تفاصیل کی سند میں احادیث پیش کرتے ہیں۔ اور سب اپنی اپنی احادیث کو صحیح اور دوسروں کی احادیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ ان اختلافات کے رفع کرنے کی آج کوئی شکل نہیں۔ اس کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ امت میں پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا احیاء ہو جائے جس کی بنیاد قرآن کریم کے محفوظ اور غیر متبدل آئین پر ہو۔ اس نظام کو اس کا حق پہنچے گا کہ وہ امت کے اختلافات کا فیصلہ کر کے ان میں پھر سے اس قسم کی وحدتِ فکر و عمل پیدا کرے جیسی وحدت عہد محمد رسول اللہ والذین معہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں تھی۔ جب تک ایسا نہ ہو امت میں جو طریقے رائج چلے آ رہے ہیں انہیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنا امت میں مزید تفرقہ کا موجب ہوگا اور تفرقہ قرآن کی رو سے شرک ہے۔

طلوعِ اسلام کی یہی دعوت اور یہی پکار ہے۔

کیا اخلاقِ رذیلہ کے بیشتر اسباب اقتصادی نہیں؟

(بقیہ صفحہ ۳۶)

کی ضرورت ہے۔ اور ان امراض کی وجہ سے مختلف ابنائے وطن کی بیشمار قوتیں جو ضائع ہو رہی ہیں۔ ان کو صحیح طور سے کام میں لانے سے گورنمنٹ کا بھی کافی فائدہ ہے اور یہ بات تو سرے سے ہے ہی محال کہ اس بے کاری اور تعطل کو صرف نصائح اور مواعظ سے ختم کر دیا جائے۔ اگرچہ نصائح و مواعظ قرآن اور حکمت قرآن پر مبنی ہوں اور ان کے پیش کرنے والے انتہائی اخلاص اور درد سے پیش کرتے ہوں۔۔۔۔ کیونکہ اندرونی اور بیرونی استعماریت، جس سے یہ معاشی مشکلات پیدا ہو چکی ہیں، بہت وسیع حلقہ اثر رکھتی ہے اور اس نے بڑی مضبوطی سے اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ بلکہ استعماریت بڑے پیمانے پر تعطل پیدا کر دیتی ہے۔ اور اگر یہی حالت رہی تو ملک کے در و دیوار صحیح و توانا بے کاروں اور ہٹے کٹے بھکاریوں سے بھر جائیں گے۔ سو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ان بے خللوں کو ختم کیا جائے۔ اور ہر فرد بشر کے لئے محنت و کام کو از روئے قانون لازمی قرار دیا جائے۔ پس یا تو وہ کام کریں اور زندہ رہیں یا پھر وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لیں اور اس کو کام کرنے والے لوگوں کے لئے خالی کر دیں۔

اسلام کی سرگزشت

(مسلسل)

صحابہ کس طرح رائے کا استعمال کرتے تھے؟

حضرت عمرؓ کے سامنے یہ قصہ لایا گیا کہ ایک آدمی کو اس کے باپ کی بیوی اور اس بیوی کے دوست نے قتل کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ کو اس میں تردد تھا کہ کیا ایک آدمی کے خون کے بدلے میں کئی آدمی قتل کئے جا سکتے ہیں؟ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ ذرا بتلایئے اگر چند آدمی ایک ذبح شدہ اونٹ کو چرا لے میں شریک ہو جائیں۔ کوئی اس کا ہاتھ لے جائے اور کوئی پاؤں کوئی ران لے جائے اور کوئی سینہ تو کیا آپ ان سب کے ہاتھ کاٹیں گے یا نہیں؟ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ضرور کاٹوں گا۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ یہاں بھی تو معاملہ یہی ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ کی رائے پر عمل کیا اور اپنے گورنر کو لکھ بھیجا کہ ان دونوں کو قصاص میں قتل کر دو کیونکہ اگر اس کے قتل میں سارے صنعاء والے شریک ہوتے تو میں ان سب کو قتل کر دینے کا حکم دیتا[1]۔

صحابہ کے درمیان مسئلہ مشترکہ میں اختلاف ہوا۔ مسئلہ مشترکہ یہ تھا کہ ایک عورت کا انتقال ہو گیا جس نے ایک شوہر، ایک ماں، علاتی بھائی اور سگے بھائی چھوڑے۔ حضرت عمرؓ نے شوہر کو نصف، ماں کو چھٹا حصہ اور علاتی بھائیوں کو ایک تہائی دلوانا چاہا مگر سگے بھائیوں کے لئے کچھ نہ بچا۔ اس پر ان سے کہا گیا کہ کیا ہمارا باپ گدھا تھا۔ کیا ہم سب ایک ہی ماں سے نہیں ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے اپنے پہلے فیصلہ سے رجوع کیا اور سب کو ایک تہائی میں شریک کر دیا۔

جب حضرت علیؓ سے پوچھا گیا کہ شراب خور کی سزا کیا ہونی چاہیئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا جب کوئی شراب پیتا ہے تو بکواس کرتا ہے اور جو بکواس کرتا ہے وہ افتراء پردازی بھی کرتا ہے۔ لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ اس کے وہی حد لگانی چاہیئے جو شریعت میں ایک افتراء پرداز کے لئے مقرر ہے۔ یعنی قاذف ــــ تہمت لگانے والے ــــ کی حد اس طرح

[1] اعلام الموقعین ص

کی بہت سی مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں قانون سازی پر غور و فکر کرنے کا کیا انداز تھا۔

حضرت عمرؓ اور "رائے"

صحابہ کے اندر اس باب یعنی رائے کو کام میں لانے میں حضرت عمرؓ پیش پیش تھے چنانچہ ان سے اس قسم کی بہت سی چیزیں نقل کی جاتی ہیں۔ اس بارے میں توفیق ایزدی بھی مسلمانوں کے شامل حال تھی۔ حضرت عمرؓ کو جس قدر ایسے مسائل کا سامنا کرنا پڑا جو قانون سازی کے محتاج تھے اور کسی خلیفہ کو ان سے پہلے نہ ان کے بعد اتنا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ حضرت عمرؓ ہی وہ خلیفہ ہیں جن کے ہاتھوں پر اس قدر کثیر فتوحات حاصل ہوئیں اور شہر کے شہر لسائے گئے اور ایران و روم کی متمدن قومیں اسلامی حکومت کی مطیع و فرماں بردار بنیں۔ یہ وہ صورت حال تھی کہ ان کے بعد پھر کسی خلیفہ کو پیش نہیں آئی۔ اقتصادی، سیاسی اور عمرانی مسائل میں حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں جو قوانین بنا دیئے تھے وہ آئندہ فیصلہ کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد اور سیر کے باب میں ——— اور یہی وہ باب ہے جس میں فاتحین کے مفتوحین کے ساتھ تعلق کی وضاحت ہوتی ہے ——— حضرت عمرؓ کے متعلق عام فقہاء کا خیال یہ ہے کہ "اس باب میں سب سے بہترین فیصلے حضرت عمرؓ ہی کے ہیں"

لیکن میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ حضرت عمرؓ مذکورہ بالا معنوں کی بہ نسبت اس کے وسیع تر معنوں میں اپنی رائے کو کام میں لاتے تھے۔ ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ رائے کو اس وقت کام میں لایا جاتا ہے جب کتاب اور سنت کے اندر کوئی صریح نص موجود نہ ہو۔ لیکن حضرت عمرؓ کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس سے بھی کئی قدم آگے بڑھ گئے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے اجتہاد کے ذریعے سے اس حکمت کا پتہ لگاتے تھے جس کی وجہ سے کوئی آیت یا حدیث کوئی حکم دیتی تھی۔ پھر اس حکمت کی رہنمائی میں وہ احکام مرتب کرتے تھے۔ یہ چیز وہی تھی جسے آج کل کی اصطلاح میں روح قانون سے رہنمائی حاصل کرنا کہہ سکتے ہیں۔ الفاظ قانون سے نہیں اس بات کی دلیل وہ روایات ہیں جو احکام کے بارے میں حضرت عمرؓ سے علماء نے بیان کی ہیں ان میں سے چند روایات ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ ..... آیہ (صدقات فقراء، مساکین، زکوٰۃ کی وصولی وغیرہ کا کام کرنے والوں اور مؤلفۃ القلوب کے لئے ہیں ..... مؤلفۃ القلوب کو قرآن نے زکوٰۃ کے مصارف میں سے شمار کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ نبی صلعم بعض لوگوں کو محض تالیف قلب کی خاطر زکوٰۃ میں سے کچھ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ آپ نے ابوسفیانؓ، اقرع بن حابسؓ، عباس بن مرداسؓ، صفوان بن امیہؓ، عیینہ بن حصنؓ کو سو سو اونٹ دیئے تھے۔ حتیٰ کہ صفوان کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلعم نے مجھے عطا فرمایا۔ آپ سے مجھے انتہائی بغض تھا مگر آپ مجھے برابر عطا فرماتے رہے۔ حتیٰ کہ آپ کی ذات میرے لئے محبوب ترین بن گئی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں عیینہؓ اور اقرعؓ دونوں حاضر ہوئے اور کچھ زمین مانگی۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو زمین دینے کے لئے ایک حکم نامہ تحریر فرما دیا۔ حضرت عمرؓ گئے اور انہوں نے اس حکمنامہ کو دیکھ کر چاک کر دیا۔ اور فرمایا کہ خدا نے اسلام کو عزت

دے دی ہے۔ اب اسے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ اگر تم اسلام پر ثابت قدم رہو تو فبہا ورنہ اب ہمارے اور تمہارے درمیان تلوار فیصلہ کرے گی۔[1]

آپ دیکھئے کہ حضرت عمرؓ نے مؤلفۃ القلوب کو دینے کی علت اس مصلحت کو قرار دیا۔ اور جب یہ مصلحت اسلام کی عزت اور غلبہ کی وجہ سے باقی نہیں رہی تو اس کی کچھ ضرورت نہیں رہی کہ اسلام لوگوں کو تالیف قلب کے لئے عطا یا دیا کرے۔ لہٰذا اس حکم کے جاری رکھنے کی حضرت عمرؓ نے ضرورت نہ سمجھی اور باوجودیکہ یہ قرآنی حکم تھا حضرت عمرؓ نے اسے بھی ختم کر دیا۔[2]

اسی طرح حضرت عمرؓ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جس سال حجاز میں قحط پڑا ہے اس سال حضرت عمرؓ نے چوروں کے ہاتھ نہیں کاٹے۔ روایت ہے کہ حاطب ابن ابی بلتعہ کے چند غلاموں نے قبیلۂ مزینہ کے کسی آدمی کی ایک اونٹنی چرالی ان کو حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا۔ انھوں نے چوری کا اقرار بھی کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے عبدالرحمٰن بن حاطب کو بلوایا اور ان سے کہا کہ حاطب کے غلاموں نے مزینہ کے ایک آدمی کی اونٹنی چرالی اور انھوں نے اقرار بھی کر لیا ہے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کثیر ابن الصلت کو حکم دیا کہ لے جا کر ان کے ہاتھ کاٹ دو۔ جب کثیر ابن الصلت ان کو لے کر چل دیئے تو پھر ان کو واپس بلایا اور فرمایا۔ بخدا اگر مجھے یہ معلوم نہ ہوتا کہ تم لوگ ان سے کام لیتے ہو اور ان کو پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں دیتے حتیٰ کہ ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اگر وہ حرام چیز بھی کھالیں تو وہ ان کے لئے حلال ہو جائیں ان کے ہاتھ کٹوا دیتا۔ خدا کی قسم اب میں ان کے ہاتھ تو نہیں کٹواؤں گا مگر تجھ پر ایسا تاوان ڈالوں گا جو تجھے ساری عمر یاد رہے...... الخ[3]

اسی طرح حضرت ابن عباسؓ سے صحیح مسلم میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ ایک وقت دی ہوئی تین طلاقیں رسول اللہ صلعم اور حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں بلکہ دو سال تک حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں بھی ایک طلاق شمار کی جاتی تھیں۔ پھر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لوگوں نے اس معاملے میں جلد بازی سے کام لیا ہے جس میں مہلت اور صبر سے کام لینا لازمی تھا لہٰذا کیوں نہ ہم ان تینوں طلاقوں کو ان پر نافذ کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے تینوں طلاقیں نافذ کر دیں۔ اس قسم کی مثالیں اور بھی بہت سی ہیں مگر جو کچھ ہم نے حضرت عمرؓ کے متعلق پہلے کہا ہے اس کے ثبوت کے لئے یہ چند مثالیں ہی کافی ہیں۔

شوریٰ و اجماع

قرن اول میں یہ رجحان بھی پایا جاتا تھا کہ مشورہ حاصل کرنے کے طریقے یا اس "رائے" کو منظم کیا جائے۔ بغوی نے میمون بن مہران سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے جب کوئی مقدمہ پیش ہوتا تو اول آپ کتاب اللہ میں دیکھتے۔ اگر اس میں کوئی فیصلہ مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرما دیتے۔ اگر کتاب اللہ میں کوئی

---

[1] زیلعی ص ۲۹۹ ج ۱

[2] یہ کہنا چاہیئے کہ ضرورت نہ رہنے کی وجہ سے ساقط العمل ہو گیا جب پھر حالات ایسے پیدا ہو جائیں گے تو اس حکم پر پھر عمل درآمد ہو جائیگا۔ (طلوع اسلام)

[3] اعلام الموقعین ص ۳۲-۳۳ ج ۲

چیز نہ ملتی اور ان کے علم میں رسول اللہ کی سنت میں کوئی چیز ایسی ہوتی جس سے اس کا فیصلہ کیا جا سکے تو آپ اس کے مطابق فیصلہ فرمادیا کرتے۔ اگر سنت میں بھی کچھ نہ ملتا تو پھر آپ باہر نکل کر مسلمانوں سے اس کے متعلق دریافت فرمایا کرتے تھے کہ میرے پاس ایسا ایسا معاملہ آیا ہے کیا تم لوگوں کو کچھ معلوم ہے کہ رسول اللہ صلعم نے اس جیسے کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ فرمایا ہو؟ اکثر ایسا ہوتا کہ بہت سے لوگ جمع ہو جاتے اور وہ بیان کرتے کہ رسول اللہ صلعم نے اس قسم کے معاملہ میں یہ فیصلہ فرمایا تھا..... اگر اس طرح رسول اللہ صلعم کی کسی سنت کا پتہ نہ لگتا تو پھر آپ بڑے بڑے سمجھدار لوگوں کو جمع فرماتے اور ان سے مشورہ لیتے۔ اگر کسی بات پر ان کا اتفاق ہو جاتا تو پھر اس کا مطابق فیصلہ فرما دیتے۔ حضرت عمرؓ کا طرز عمل بھی یہی تھا۔ اگر قرآن اور سنت میں انھیں کوئی چیز نہ ملتی تو وہ اس کے بعد بھی یہی دیکھتے کہ آیا اس بارے میں حضرت صدیق اکبرؓ کا کوئی فیصلہ موجود ہے یا نہیں۔ اگر صدیق اکبرؓ کا کوئی فیصلہ مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرمایا کرتے ورنہ پھر قوم کے سربرآوردہ لوگوں کو اکٹھا کر کے ان سے مشورہ فرماتے اور جو بات وہ متفقہ طور پر طے کر دیتے اس کے مطابق فیصلہ فرما دیا کرتے۔

امام سرخسی کی مبسوط میں ہے کہ حضرت عمرؓ باوجود خود اپنے فقیہ ہونے کے صحابہ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ جب کوئی نئی بات سامنے آتی تو فرمایا کرتے۔ ذرا علیؓ کو میرے پاس بلاؤ۔ ذرا زیدؓ کو میرے پاس بلاؤ۔ پھر ان سے مشورہ فرمایا کرتے اور جو کچھ یہ حضرات اتفاق رائے سے فیصلہ فرماتے اس کے مطابق فیصلہ کیا کرتے۔

شعبیؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے سامنے کوئی معاملہ آتا تو بعض اوقات اس پر ایک مہینہ تک غور و فکر کرتے رہتے اور صحابہؓ سے برابر مشورہ کرتے رہتے اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ آج ہی ایک مجلس میں سو سو معاملوں کا فیصلہ کر دیا کرتے۔

سعید بن المسیب نے حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے کہ میں نے عرض کیا اے رسول اللہ! اگر ہمارے سامنے کوئی ایسا معاملہ آجائے کہ اس کے بارے میں نہ قرآن میں کوئی حکم نازل ہوا ہے اور نہ آپ کی سنت میں کوئی رہنمائی موجود ہے تو ہم کیا کریں تو آپؐ نے فرمایا کہ اس کے لئے مسلمانوں میں سے جاننے والوں کو، یا یوں فرمایا کہ عبادت گذار لوگوں کو اکٹھا کر لیا کرو اور آپس میں اسی طرح مشورہ کر لیا کرو۔ ایک آدمی کی رائے پر کوئی فیصلہ نہ کر لیا کرو۔

شریحؒ سے روایت ہے کہ مجھ سے حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلعم کے فیصلوں سے جو کچھ تمہیں واضح ہو جائے اس کے مطابق فیصلہ کر دیا کرو۔ اگر رسول اللہ صلعم کے فیصلوں میں کوئی بات نہ ملے تو پھر ائمہ مہتدین کے فیصلوں سے جو کچھ واضح ہو اس کے مطابق فیصلہ کر دیا کرو۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اپنی رائے سے اجتہاد کرو اور اہل علم و صلاح سے مشورہ لے لیا کرو۔

لیکن ——— ہمیں بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ——— اس کا کوئی واضح اور متعین نظام مرتب نہیں کیا گیا جس سے شوریٰ کی کیفیت واضح ہو سکتی۔ اور یہ معلوم ہو سکتا کہ مشورہ کن لوگوں سے کیا جائے اور جن سے مشورہ کیا جائے ان کی رائے کی قیمت کیا ہے؟..... حالانکہ اس تنظیم کی سخت ضرورت تھی۔ اندلس والوں نے اس سلسلہ میں ایک مجلس شوریٰ مقرر کر کے صحیح قدم اٹھایا تھا۔ جس کے ممبران خلیفہ کی طرف سے نامزد ہوتے تھے۔ مگر یہاں اس پر بحث کرنے کا موقعہ نہیں ہے۔

بہرحال رائے سے کام لیا جاتا تھا۔ کبار صحابہؓ میں بہت سے ایسے صحابی تھے جنہوں نے اپنی رائے سے فتویٰ دے کر معاملات کے فیصلے کئے۔ مثلاً ابوبکرؓ، عمرؓ، زید بن ثابتؓ، ابی ابن کعبؓ، معاذ بن جبلؓ، وغیرہ۔ اس مدرسہ یا اس مسلک کے علمبردار بلکہ پیشرو ــــ ہماری رائے میں ــــ حضرت عمر ابن الخطابؓ تھے۔ جو لوگ اللہ کے اس طریقہ پر چلنے والوں میں سے عراق میں سب سے زیادہ مشہور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے۔ وہ حضرت عمرؓ کے عاشق تھے اور ان کی آراء کو بہت ہی پسند کرتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں تو ایسا سمجھتا ہوں کہ حضرت عمرؓ کے ساتھ علم کے دس حصوں میں سے نو حصے ختم ہو گئے (اعلام الموقعین میں ہے کہ ابن مسعودؓ کسی بات میں بھی حضرت عمرؓ کی مخالفت نہیں کرتے تھے[1] شعبی کہتے ہیں کہ نماز فجر میں عبداللہ ابن مسعودؓ قنوت نہیں پڑھتے تھے۔ اور اگر حضرت عمرؓ نے قنوت پڑھی ہوتی تو حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ بھی ضرور پڑھتے۔ نیز کہا

صحابہ کا جُدا جُدا اندازِ فکر

کرتے تھے کہ تین آدمی ایک دوسرے سے فتویٰ پوچھتے رہتے تھے۔ حضرت عمرؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ اور زید بن ثابتؓ۔ یہ تینوں حضرات ایک دوسرے سے استفادہ کرتے رہتے تھے۔ دوسری طرف حضرت علیؓ، ابی بن کعبؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ تھے۔ یہ تینوں آپس میں ایک دوسرے سے استفادہ کیا کرتے تھے۔ شعبیؒ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے صحابہ کا انداز فکر الگ الگ تھا۔ ان میں سے ان دو تین جماعتوں کا انداز فکر بھی جدا جدا تھا کہ ہر جماعت اپنے ممبران کے انداز فکر کو پسند کرتی اور آپس میں ایک دوسرے کی تائید کرتی تھی۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا انداز فکر وہی تھا جو حضرت عمرؓ کا تھا۔ یعنی جہاں نص نہ ملے وہاں رائے سے کام لینا یہ رجحان حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ میں بہت واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ابو عمرو شیبانی کا بیان ہے کہ میں عبداللہ ابن مسعودؓ کے پاس سال بھر تک بیٹھتا رہا۔ میں نے انہیں یہ کہتے کبھی نہیں سنا کہ رسول اللہ صلعم نے یوں فرمایا ہے۔ اگر کبھی یہ بات ان کے منہ سے نکل جاتی تو جسم پر کپکپی پڑ جاتی تھی[2]

ابراہیم نخعیؒ کا قول ہے کہ جہاں حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ کے اقوال اکٹھے ہو جائیں تو پھر میں اس کے برابر کسی کے قول کو بھی نہیں سمجھتا۔ البتہ اگر ان دونوں میں اختلاف ہو تو میرے نزدیک عبداللہ ابن مسعودؓ کا قول زیادہ پسندیدہ ہوتا ہے کیونکہ ان کے قول میں ایک لطافت اور باریکی ہوتی ہے۔

عراق کا اسکول عبداللہ ابن مسعودؓ اور عمرؓ سے متاثر تھا

آپ جانتے ہیں کہ اہل عراق کا علم زیادہ تر عبداللہ ابن مسعودؓ ہی سے متاثر تھا اور یہ بھی کہ عراقی اسکول کے سرتاج امام ابوحنیفہؒ ہیں[3] تو آپ کو یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیئے کہ عراقی مدرسۂ فقہ، رائے اور قیاس کو کام میں لانے کے لئے جو

---

[1] ص ۲۲ ج ۱۔ [2] اعلام الموقعین۔ [3] اس مدرسۂ فقہ کا سلسلہ یہ ہے۔ امام ابوحنیفہ نے فقہ حماد ابن ابی سلیمان سے حاصل کیا۔ انہوں نے ابراہیم نخعی سے انہوں نے علقمہ ابن قیس سے اور علقمہ ابن قیس عبداللہ مسعودؓ کے شاگرد تھے۔

مشہور ہوا ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب کیا تھا، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا اثر ہی اس کا سب سے بڑا سبب تھا۔

رائے کا یہ اسکول پہلی اور دوسری صدی ہجری میں خوب پھیل چکا تھا حتیٰ کہ لوگوں کو اس کی طرف نسبتیں دی جانے لگی تھیں۔ لوگوں نے امام ربیعہ کا نام جو کبار تابعین میں سے تھے اور امام مالکؒ کے استاد تھے "ربیعۃ الرائے" رکھ دیا تھا۔ آپ

عراق "رائے" کا مرکز تھا

آزاد کردہ غلاموں میں سے تھے، اکثر تابعین اور تبع تابعین اسی اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً حسن بصری وغیرہ۔ مگر اس فقہی اسکول کا بڑا مرکز عراق ہی تھا۔ جس کی زیادہ تر تین وجہیں تھیں۔

(اول) عراق میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے اثرات۔ ان کے متعلق پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ان کا رجحان رائے کی طرف زیادہ تھا۔ اور اس میں وہ اپنے استاد حضرت عمر بن الخطاب کے ساتھ شریک تھے۔

(دوم) ابن خلدون کے بیان کے مطابق عراق میں احادیث کی قلت۔ کیونکہ حدیثیں بیان کرنے والے زیادہ تر حجازی تھے کیونکہ نبی اکرم صلعم اور کبار صحابہ کا وہی وطن تھا۔

(سوم) عراق ایک متمدن ملک تھا۔ وہ بڑی حد تک ایرانی اور یونانی تہذیبوں سے متاثر تھا۔ مدنیت، ایک قانون ساز کی نگاہوں میں ایسی بے شمار جزئیات لے آتی ہے جس کے لئے قانون وضع کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جو ایک بادیہ نشین ملک کو پیش نہیں آتی۔ اس کے ساتھ جب یہ بات بھی مل جائے کہ اس ملک میں حدیثوں کا رواج ہی کم ہو تو لامحالہ اس کا نتیجہ رائے کو کام میں لانے کی صورت ہی میں نکل سکتا ہے۔[1]

"رائے" کے اسکول کے نمایاں امتیازات

"رائے" کے اس اسکول کے چند نمایاں امتیازات تھے۔

۱۔ بکثرت فروعات نکالنے کا شوق حتیٰ کہ خیالی فروعات بھی۔ اپنی مدنیت کے پیش نظر چونکہ انہیں بکثرت حوادث و واقعات پیش آتے تھے اس لئے انہیں ابتداءً تو کثرت فروعات پر اس وجہ سے مجبور ہونا پڑا پھر اس کے بعد جب وہ اس راستہ پر چل پڑے تو فرضی فروعات کے پیچھے بھی پڑ گئے۔ چنانچہ آپ ان کے ہاں یہ انداز بہت پائیں گے کہ اگر ایسا ہو تو حکم یوں ہوگا، اور اگر ایسا ہو تو یوں ہوگا۔ وہ مسائل کو تمام ممکن اور غیر ممکن صورتوں پر گھماتے تھے حتیٰ کہ محدثین نے ان کا نام ہی " اَرَأَیْتِیُّوْن " (اگر مگر کرنے والے) رکھ چھوڑا تھا۔ شعبی نے کہا ہے کہ "ان لوگوں کی وجہ سے مجھے مسجد سے بھی سخت نفرت ہوگئی ہے۔ حتیٰ کہ مسجد میری نگاہوں میں گھر پر کوڑا کرکٹ ڈالنے کی جگہ سے بھی زیادہ نفرت کی جگہ بن گئی ہے۔ میں نے کہا کہ اے ابو عمر! یہ کون لوگ ہیں؟ تو شعبی نے کہا کہ یہی اگر مگر کرنے والے لوگ۔" اور کہا کرتے تھے کہ "مجھے اگر

[1] الموافقات صـ ۱۸۶ ج ۴

یوں ہو تو" سے زیادہ کوئی لفظ بُرا نہیں لگتا"۔ امام مالک بن انسؒ سے لوگ زیادہ سوال نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ان کے شاگرد ان سے بہت ڈرا کرتے تھے۔ اسد بن الفرات کا بیان ہے ـــــ وہ امام مالک بن انسؒ کے پاس آئے ہوئے تھے ـــــ کہ ان کے شاگرد سوالات پوچھنے میں مجھے آگے کر دیا کرتے تھے۔ جب وہ کوئی جواب دیتے تو لوگ چپکے چپکے مجھ سے کہتے کہ امام صاحب سے پوچھو کہ اگر صورت یوں ہو تو جواب کیا ہوگا۔ میں ان سے پوچھا کرتا۔ ایک دن امام صاحب مجھ سے زچ آکر کہنے لگے کہ یہ تو ایک سلسلۂ درانہ ہے اگر تمہیں اس کی خواہش ہے تو عراق چلے جاؤ۔[1] سعید بن المسیب نے امام ربیعۃ الرائے سے جنہوں نے کسی مسئلہ پر اعتراض کیا تھا۔ فرمایا تھا کہ "کہیں تم عراقی تو نہیں ہو..... الخ" عراقیوں کے اس عمل نے فقہ کو ضخیم بنا دیا تھا بے شمار مسائل پیدا کر دیئے تھے کہ دوسرے علماء بھی ان کے مستنبط کردہ مسائل پر غور کرنے اور اپنے مذاہب کے اصول کے مطابق ان کے احکام بیان کرتے تھے۔ غالباً سریانی منطق کا یہ اثر تھا جو عراق میں فتوحِ اسلامی سے بہت پہلے پھیلی ہوئی تھی ـــــ اس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ـــــ اس طرح شدہ شدہ فقہ کا وہ قالب تیار ہو گیا جو عراقیوں نے تفریع مسائل میں اپنا لیا تھا۔

۲۔ عراقی علماء حدیثیں بہت کم روایت کرتے تھے اور حدیثوں کے قابل قبول ہونے کے لئے انہوں نے اتنی کڑی شرطیں لگا دی تھیں کہ ان کے مطابق بہت تھوڑی سی حدیثیں معیار پر اترتی تھیں۔

انکارِ حدیث

حتیٰ کہ کچھ لوگوں کو اس میں غلو ہو گیا تھا اور انہوں نے سرے سے حدیثوں کو قبول کرنے ہی سے انکار کر دیا تھا۔ ان لوگوں کی دلیل، راویانِ حدیث کے بارے میں غیر مشروط شک و شبہ تھا نیز یہ بات کہ جن راویانِ حدیث کو محدثین نے مجروح قرار دیا ہے وہ بکثرت ہیں۔ حتیٰ کہ ایک محدث بھی ایسا نہیں نکلتا جس کی سچائی اور امانت پر تمام محدثین کو اتفاق ہوا ہو۔ چنانچہ یہ کہتے تھے۔ ہم کتاب اللہ کو جس کا ثبوت قطعی ہے ان جیسی مشکوک حدیثوں کی وجہ سے کس طرح چھوڑ دیں۔ حتیٰ کہ جن لوگوں کی سچائی اور امانت ظاہر ہو ان کے دلوں کا حال بھی ہمیں کیا معلوم ہے کہ ان میں کیا ہے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ یہ کوئی چھوٹی موٹی جماعت نہیں تھی بلکہ خاصی بڑی جماعت تھی جن کی تردید کے لئے امام شافعیؒ کو اپنی کتاب "الام" میں ایک مستقل اور طویل باب باندھنا پڑا جس کا عنوان تھا۔ "اس جماعت کے اقوال کو بیان کرنے کا باب" جنہوں نے تمام حدیثوں کو رد کر دیا ہے۔[2] امام شافعیؒ نے ان لوگوں کی آراء بیان کی ہیں اور پھر ان پر طویل اور عمدہ بحث کی ہے۔[3] اس کے بعد امام شافعی نے ایک اور باب باندھا ہے جس میں ان لوگوں کی تردید کی گئی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ صرف وہی حدیثیں قبول کی جا سکتی ہیں جن پر لوگوں کا اتفاق ہو۔ رہ گئیں وہ روایات جن میں اختلاف رہا ہو ان پر قیاس کو ترجیح دی جائے گی۔[4] بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ چونکہ یہ قول محدثین کے لئے بڑا ہی خطرناک تھا اس لئے

---

[1] الموافقات ص ۱۸۷ ج ۴۔ [2] الام ص ۲۵ ج ۷ و مابعد

[3] الام ص ۲۵۴ ج ۷ و مابعد

محدثین ان لوگوں کی باتوں کو نقل کرنے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ چنانچہ شہرستانی ان کے اقوال کو نقل کرتے ہیں۔ نہ ان کے دلائل بیان کرتے ہیں۔ ان کی کچھ پیچیدہ اور مجمل سی باتیں ہی اِدھر اُدھر سے ہمیں کہیں مل جاتی ہیں۔ بغدادی نے انکارِ حدیث کے قول کو اپنی کتاب "اصولِ دین" میں خوارج کی طرف منسوب کیا ہے۔

اہلِ حدیث کا اسکول

اس اسکول کے مقابلے میں، حدیث یا اہلِ حدیث کا اسکول تھا۔ ہمیں اس اسکول کی بنیاد صحابہ کے عہد میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً حضرت عباس، زبیر، عبداللہ بن عمر بن الخطاب، عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم حدیث کے اسکول کے پیشرو تھے۔ تابعین میں سے شعبی اسی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے۔ جو کچھ یہ لوگ رسول اللہ صلعم کے اصحاب سے نقل کریں اسے لے لو اور جو کچھ وہ اپنی رائے سے بیان کریں اسے کوڑے میں پھینک دو۔ ان لوگوں کا مسلک یہ تھا کہ ان سے کوئی بات پوچھی جاتی تو اگر اس کے بارے میں انہیں کوئی آیت یا حدیث معلوم ہوتی تو وہ فتویٰ دیدیا کرتے ورنہ خاموش رہتے۔ روایت ہے کہ کسی آدمی نے حضرت سالم بن عبداللہ بن عمرؓ سے کوئی مسئلہ پوچھا تو سالمؒ نے فرمایا کہ "میں نے اس بارے میں کچھ نہیں سنا۔ اس آدمی نے کہا

رائے کے خلاف محدثین کا غلو

کہ مجھے آپ اپنی رائے سے بتا دیجئے۔ سالمؒ نے اس سے انکار کر دیا۔ اس آدمی نے پھر اصرار کیا اور کہا "میں تو آپ کی رائے کو بہت پسند کرتا ہوں۔ سالم نے کہا کہ شاید میں تمہیں اپنی رائے سے کچھ بتا دوں پھر تم تو چلے جاؤ اور اس کے بعد میری رائے تبدیل ہو جائے تو میں تمہیں کہاں ڈھونڈتا پھروں گا"۔ عبداللہ بن احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا کہ اگر ہم کسی ایسے شہر میں ہوں جہاں اہلِ حدیث تو ایسے ہوں جنہیں صحیح اور ضعیف حدیث کی بھی کوئی پہچان نہ ہو۔ دوسری طرف اصحابِ رائے موجود ہوں اور کوئی حادثہ پیش آجائے تو مسئلہ کس سے پوچھیں۔ میرے والد نے فرمایا کہ اہلِ حدیث ہی سے پوچھنا چاہیئے۔ ضعیف الحدیث آدمی بہر حال صاحب الرائے لوگوں سے زیادہ قوی ہوتا ہے[1]۔ اس قسم کے اقوال بے شمار ملتے ہیں۔

اس اسکول کا غلبہ حجاز میں تھا۔ اس کے اسباب ان اسباب کے برعکس تھے جن کا ہم عراق کے سلسلہ میں ذکر کر چکے ہیں۔ اس اسکول کے امتیازات حسبِ ذیل تھے۔

(۱) فرضی سوالات پوچھنے سے ان کو شدید نفرت تھی۔ کیونکہ ان کے نزدیک قانون سازی کا سب سے بڑا سرچشمہ حدیث تھا جو محدود تھا۔ یہ حضرات رائے سے کام لینے کو بُرا جانتے تھے۔ ایسے بہت سے اقوال نقل کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرضی سوالات پوچھنے سے متنفر تھے۔ عراقیوں پر ان کی طرف سے یہی اعتراض کیا جاتا تھا کہ وہ فرضی سوالات کا جواب دیتے تھے۔

---

[1] اعلام الموقعین صـ ۸۸ ج ۱

۲-۱ اس اسکول کے امتیازات میں سے حدیثوں کو بڑی اہمیت دینا بھی تھا۔ حتیٰ کہ وہ ضعیف حدیثوں کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ حدیث کی شرائط میں تساہل برتتے تھے اور علماء کی رائے پر اسے ترجیح دیتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے امام احمد بن حنبل سے نقل کیا ہے۔

یہ غلو ہی وضع حدیث کا سب سے بڑا سبب تھا

یہ اسکول ـــ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ـــ حدیثیں وضع کرنے کا ایک بڑا سبب تھا جب کچھ ایسے لوگوں نے دیکھا جنھیں سچ اور جھوٹ کی زیادہ پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ بے شمار ایسے مسائل ہیں جن کے بارے میں کوئی نص نہیں ملتی۔ اور ان کے اسکول کے علماء رائے کو پسند نہیں کرتے کہ اس سے مشکلات حل ہو سکیں۔ لہٰذا انہوں نے بے شمار حدیثیں گھڑ کر رکھ دیں جن سے دراصل وہ اس خلاء کو پُر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ عتیق زبیدی کہتے ہیں کہ امام مالک نے دس ہزار حدیثوں سے مؤطا مرتب فرمائی تھی۔ ہر سال اس پر غور و فکر فرماتے اور حدیثیں کم کرتے چلے جاتے حتیٰ کہ اتنی سی حدیثیں باقی رہ گئیں۔ اگر کچھ دن اور زندہ رہ جاتے تو غالباً ساری حدیثیں ہی ختم کر ڈالتے۔[1] اس کی دلیل فقہ کی وہ کتابیں ہیں جو ہم تک پہنچی ہیں حتیٰ کہ امام ابوحنیفہؒ کی فقہ کو دیکھ جائیے جو اپنے زمانہ میں رائے سے کام لینے میں بہت ہی مشہور تھے۔ لیکن آپ ان کی فقہ میں کوئی جزئی مسئلہ بھی ایسا نہیں پائیں گے جس کی تائید میں رسول اللہ صلعم یا کسی صحابی کی کوئی حدیث پیش نہ کی گئی ہو۔ حالانکہ معتبر علماء کا بیان ہے کہ امام صاحب کے نزدیک بہت کم حدیثیں صحیح قرار پائی ہیں اور علماء نے ان حدیثوں کے بیشتر حصّے کے ضعیف ہونے پر تنبیہ فرمائی ہے جو ان کتابوں میں نقل کی گئی ہیں۔[2]

جیسا کہ اہل الرائے علماء نے غلو سے کام لیا ایسے ہی اہل حدیث نے بھی کم غلو نہیں کیا۔ حتیٰ کہ ان میں سے کچھ لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ سنت، کتاب اللہ پر بھی حاکم ہے اور کتاب اللہ سنت پر حاکم نہیں ہے۔ اور یہاں تک کہ دوسری صدی ہجری میں یہ کہنے والے بھی پیدا ہو گئے کہ سنت کتاب اللہ کو منسوخ کر دیتی ہے۔

اہل الرائے اور اہل حدیث کا نزاع

ان دونوں اسکولوں میں شدید نزاع تھا۔ ہر فریق دوسرے پر طامت کے تیر چلاتا تھا اور ہر مدرسہ اپنی تائید میں حدیثیں گھڑتا تھا۔ حدیث کا اسکول جب یہ حدیث نقل کرتا تھا کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ وہ زمانہ قریب آرہا ہے جب ایک آدمی اپنے چھپرکھٹ پر تکیہ لگائے بیٹھا ہوگا اور اس کے سامنے میری حدیث نقل کی جائے گی تو وہ کہے گا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کن چیز کتاب اللہ ہے جو چیزیں اس میں حلال ہیں ان کو ہم حلال کریں گے اور جو چیزیں اس میں حرام ہیں ان کو ہم حرام قرار دینگے یاد رکھئے

---

[1] الدیباج المذہب فی تراجم المالکیۃ لقاضی ابن فرحون صفحہ ۲۵

[2] زیلعی کی کتاب نصب الرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ ملاحظہ فرمائیے۔

کہ جن چیزوں کو اللہ کے رسول نے حرام قرار دیا ہے وہ بھی ایسی ہی حرام ہیں جیسے خدا کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں[۱] اس کے مقابلے میں اہل الرائے نے یہ حدیث گھڑی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جو کچھ تمہارے سامنے میری طرف سے پیش کیا جائے اسے کتاب اللہ پر پیش کر کے دیکھو اگر وہ کتاب اللہ کے مطابق ہو تو اسے قبول کر لو اسے میں نے ضرور کہا ہوگا۔ اور اگر کتاب اللہ کے خلاف پاؤ تو میں نے اسے نہیں کہا۔ میں کتاب اللہ کے خلاف کیسے کہہ سکتا ہوں حالانکہ خدا نے میری رہنمائی کتاب اللہ کے ذریعے ہی کی ہے[۲] اسی سے اس تناقض کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے جو عام کتابوں میں ہمیں نظر آتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ سے رائے سے کام لینے کے بارے میں بھی روایات نقل کی جاتی ہیں اور رائے کی مذمت میں بھی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ سے بھی دونوں قسم کی روایتیں نقل کی گئی ہیں۔ ایسے ہی ابن مسعودؓ سے بھی[۳]۔ ان متناقض اقوال میں تطبیق دینا علماء کے لئے بڑا ہی مشکل ہو گیا ہے۔ آخر انہیں کہنا پڑا کہ رائے کی ایک نوع محمود ہے اور ایک نوع مذموم۔ اور جن روایات میں رائے کی مذمت آئی ہے ان میں وہی مذموم نوع مراد ہے۔ لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ یہ متناقض اقوال ان متصادم اسکولوں کے اثرات ہیں۔ جو جس اسکول کا پیرو ہو گیا اس نے اپنے اسکول کی تائید میں حدیثیں گھڑنی شروع کر دیں۔ نہ اس نے اس باب میں حق بات کی کوئی رعایت کی اور نہ خدا کا خوف کیا۔

ان دونوں اسکولوں میں عجیب عجیب مقابلے ہوتے تھے جس کا ایک نمونہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

ربیعۃ الرائے نے سعید بن المسیب سے عورت کی انگلیوں کی دیت کے متعلق پوچھا کہ ایک انگلی کی دیت کیا ہوگی؟ سعید بن المسیب نے کہا کہ ایک انگلی کی دیت دس اونٹ ہوں گے۔ ربیعۃ الرائے نے دو انگلیوں کی دیت پوچھی تو انہوں نے بیس اونٹ بتلائی۔ جب تین انگلیوں کی دیت پوچھی تو انہوں نے تیس اونٹ بتائی۔ اس کے بعد ربیعہ نے چار انگلیوں کی دیت پوچھی تو انہوں نے بیس اونٹ بتائی۔ ربیعہ نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ جب اس کا زخم زیادہ ہوتا ہے تو دیت کم ہو جاتی ہے؟ تو سعید بن المسیب نے فرمایا کہ کیا تم عراقی ہو؟ سنت یہی ہے۔ (باقی)

۱؎ یہ حدیث شاطبی کی موافقات صفحہ ۔ جلد ۴ میں ہے۔

۲؎ یہ حدیث بھی موافقات صفحہ ۹ جلد ۴ پر ہے اور شاطبی نے اس کو موضوع قرار دیا ہے۔ [ہو سکتا ہے کہ سلسلۂ اسناد کی رو سے یہ حدیث ضعیف ہو لیکن متن کے اعتبار سے اس سے بڑھ کر صحیح حدیث اور کون سی ہو سکتی ہے۔ طلوعِ اسلام]

۳؎ ان تمام اقوال کو ابن القیم نے اعلام الموقعین جلد اول میں نقل کیا ہے۔

رابطۂ باہمی

ڈیرہ غازی خان کا دورہ

اعلان کے مطابق پرویز صاحب مع چند رفقاء ۹ مارچ کی صبح ڈیرہ غازی خاں کی طرف روانہ ہوئے۔ ملتان اسٹیشن پر احباب ڈیرہ کے نمائندہ، چوہدری محمد اسمٰعیل صاحب شہید ایس۔ ڈی۔ او۔ ہمارا استقبال کے لئے موجود تھے۔ چوہدری صاحب سے اس سے پہلے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن ہم آہنگی فکر و نظر کا تعلق ایسا ہے کہ قلوب میں تعارف سے پہلے ہی یگانگت موجود ہوتی ہے۔ ان کا قرآنی ذوق اور علاقہ سے متعلق معلومات ایسا زادِ راہ تھا جس سے راستہ یہاں سے وہاں تک تختۂ گل بنتا چلا گیا۔ ملتان سے بیس میل کے فاصلہ پر مظفر گڑھ کے احباب منتظر تھے۔ وہ بڑی محبت اور تپاک سے ملے۔ ہمارے ذہن میں ہی نہیں تھا کہ ایسے دور افتادہ علاقہ میں اس قدر احباب قرآنی فکر سے ہم آہنگ موجود ہیں۔ چونکہ ہمیں ڈیرہ غازی خاں وقتِ معینہ پر پہنچنا تھا، اس لئے مظفر گڑھ کے احباب کے لئے بہت تھوڑا وقت نکل سکا (جس کا ہمیں افسوس ہے)۔ غروبِ آفتاب کے قریب ڈیرہ غازی خاں پہنچ گئے جہاں محترم ڈاکٹر ملک محمد حیات، میڈیکل سپرنٹنڈنٹ کے ہاں اجتماع کا انتظام تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جس ذوق شوق سے یہ اہتمام کر رکھا تھا وہ ان کے حسنِ طبیعت، خلوص و محبت اور قرآن سے والہانہ عشق کا آئینہ دار تھا۔ یہ اجتماع شہر اور مضافات کے اربابِ علم و بصیرت پر مشتمل تھا۔ نمازِ مغرب کے بعد ڈاکٹر صاحب نے حاضرین سے ان الفاظ میں پرویز صاحب کا تعارف کرایا۔

تعارف

عزیز حاضرین! اس سے پہلے کہ آپ ہمارے عزیز مہمان کے خیالات سے مستفید ہوں اگر آپ اجازت دیں تو میں چند الفاظ میں جناب پرویز صاحب کا تعارف کرا دوں۔ میرا خطاب خاص کر ان حضرات سے ہے جن کو صاحب موصوف کی ذات اور ان کے مشن سے واقفیت کا ابھی تک موقع نہیں ملا۔

جناب غلام احمد پرویز چھ سال ہوئے کیبنٹ سیکرٹریٹ حکومت پاکستان سے اسسٹنٹ سیکرٹری کے عہدہ سے

ریٹائر ہوئے ہیں۔ انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ قرآن کریم اور علوم حاضرہ کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ ان کے مطالعہ کی وسعت کا اندازہ صرف وہی حضرات لگا سکتے ہیں جنھوں نے ان کے لٹریچر کو پڑھا ہے۔

صاحب موصوف اپنے گہرے مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جس چیز کو گذشتہ چند صدیوں سے "مذہب اسلام" کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کو اسلام سے بہت ہی کم تعلق ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلام مذہب ہے ہی نہیں۔ لفظ مذہب ایک غیر قرآنی لفظ ہے۔ اسلام ایک دین ہے۔ یہ ایک IDEOLOGY ہے ایک SOCIAL ORDER یا نظام ہے۔ قرآن ایک خاص نظام کی تشکیل چاہتا ہے جس سے ایک طرف انسانی ذات یا خودی میں پختگی پیدا ہو اور انسان شرف انسانیت کی تکمیل کر سکے۔ اور دوسری طرف انسان فطرت کے خزانوں کی تسخیر کرے اور انھیں بنی نوع انسان کی بہبودی اور نشوونما کے لئے کام میں لائے۔ اس قسم کے قرآنی نظام کو پرویز صاحب نظام ربوبیت کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیف نظام ربوبیت میں اسے کھول کر بیان کیا ہے اہل فکر کو اس کتاب کے مطالعہ کی میں ضرور ترغیب دوں گا۔

آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جو شخص بھی اس قسم کا پروگرام لے کر اٹھے گا اس کی ہر طرف سے مخالفت کی جائیگی۔ جس طرح سرسید۔ علامہ اقبال اور قائد اعظم پر کفر کے فتوے عائد کئے گئے۔ اسی طرح پرویز صاحب کی بھی مخالفت کی جا رہی ہے۔ خاص کر ہمارے علمائے کرام کے طبقہ سے۔ کہیں انھیں ملحد و بے دین کہا جاتا ہے۔ کہیں منکر رسالت۔ کہیں منکر حدیث۔ لیکن قرآن کی آواز کو دبانے کی یہ کوشش بفضلہ الٰہی روز بروز ناکام ہو رہی ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ قرآن کی طرف کھنچا چلا آ رہا ہے۔

علامہ اقبال مرحوم کی طرح پرویز صاحب نے بھی قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ کو اپنا مخاطب بنایا ہے۔ اس کی وجہ خود ان کے الفاظ میں سنئے۔ "قوموں کی تقدیر اُن کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جس قسم کے سانچوں میں ان کے قلب و دماغ کو ڈھالا جائے گا۔ اسی قسم کا اس قوم کا مستقبل ہوگا۔ قوموں کی قسمتوں کے فیصلے بساط سیاست یا میدان جنگ میں نہیں ہوتے یہ فیصلے ان کے مکتبوں اور تربیت گاہوں میں ہوتے ہیں۔ کوئی قوم اپنے حریف مقابل سے نہیں پٹتی۔ وہ اپنے نوجوانوں کی غلط تعلیم سے پٹتی ہے۔ میری تمام کاوشوں کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ میں نے قرآن سے سمجھا ہے اسے کسی نہ کسی طرح قوم کے نوجوانوں تک پہنچا دوں۔"

پرویز صاحب کو اس امر کا بھی احساس ہے کہ نوجوان طبقہ کو قرآن سمجھنے میں کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ایک تو یہ کہ قرآن کا ترجمہ جس انداز سے ہوا ہے اس سے قرآن کا صحیح مفہوم سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اور دوسرے یہ کہ قرآن کا اسلوب بیان انسانی تصانیف کے انداز سے مختلف ہے۔ انسانی تصنیف کا یہ انداز ہوتا ہے کہ مصنف کتاب کو مختلف ابواب یا عنوانات میں تقسیم کر دیتا ہے۔ اور اس ایک عنوان کے متعلق جو کچھ کہنا ہوتا ہے اس کے ماتحت سب کچھ لکھ دیتا ہے

لیکن قرآن کا انداز مختلف ہے۔ وہ ایک موضوع کو مسلسل اور متواتر ایک ہی مقام پر بیان نہیں کرتا۔ وہ ایک جگہ ایک بات کہتا ہے۔ دوسری جگہ اس میں اضافہ کرتا ہے۔ کسی جگہ اس کی مزید وضاحت کرتا ہے۔ اس اسلوب بیان کا نام قرآن کی اصطلاح میں تصریف آیات ہے۔ یعنی آیات کو پھیر پھیر کر لانے سے مفہوم کی وضاحت کرتے جانا۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے پرویز صاحب نے سینکڑوں ابواب اور ہزاروں عنوانات چنے اور ہر عنوان کے تحت قرآن کی تعلیم کو ایک مربوط اور SELF CONTAINED مقالہ کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔ اس طرح ہر موضوع کی تمام متعلقہ آیات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ اور ان ابواب کو مختلف مجلدات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جو معارف القرآن' کے نام سے شائع ہو رہی ہیں۔

جب پرویز صاحب کے دل میں قرآن کی اس انداز کی تفسیر کا خیال آیا تو انھوں نے علامہ اقبال کو اس کے بارے میں لکھا کہ اگر قرآن کی ایسی تفسیر ہو جائے تو نوجوان طبقہ کو قرآن سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ہے یہ کام کسی آدمی کے کرنے کا ہے۔ علامہ نے جواب دیا کہ میاں تھوڑی دیر کے لئے تم ہی " آدمی" بن جاؤ۔ اس کوشش کو شروع کر دو اللہ رہنمائی کرے گا۔ الحمد للہ کہ وہ نوجوان عزیز وہ "آدمی" بن گئے اور اب تک معارف القرآن کی جلدوں میں چھپ چکی ہے جن کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

ابلیس و آدم۔ من و یزداں۔ جوئے نور۔ شعلہ مستور۔ برق طور۔ معراج انسانیت۔ انسان نے کیا سوچا؟

معارف القرآن کے علاوہ سلیم کے نام خطوط کا ایک مجموعہ بھی قابل ذکر ہے۔ سلیم ایک دور حاضرہ کا نوجوان ہے جس سے پرویز صاحب مخاطب ہوتے ہیں۔ اور ان کیس خطوط میں اس کے دل کا ایک ایک کانٹا نکالتے چلے جاتے ہیں اور ان تمام شکوک کا ازالہ کرتے ہیں جو ہمارے نوجوان طبقہ کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں۔

اسی طرح طاہرہ کے نام خطوط' میں اسلام کی بیٹیوں سے خطاب کیا گیا ہے جس میں نکاح، طلاق، تعدد ازدواج، مہر، جہیز، پردہ جیسے عنوانات پر بحث کی گئی ہے۔

قرآنی بصیرت کو عام کرنے کے لئے پرویز صاحب کی کوششوں سے ایک ماہنامہ طلوع اسلام" ادارہ طلوع اسلام لاہور سے جاری ہے۔

قرآنی لغات اور مفہوم القرآن دو اور اہم تصنیفات زیر طبع ہیں۔ جن کا نہایت بے صبری سے انتظار کیا جا رہا ہے ان کے شائع ہونے کے بعد قرآن کے سمجھنے میں مزید آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ پرویز صاحب نہ کسی فرقہ سے متعلق ہیں۔ نہ کسی پولیٹکل پارٹی سے۔ نہ ان کو کسی ادارہ کی سرپرستی حاصل ہے اور نہ مالی امداد۔ تصانیف سے جو رقم وصول ہوتی ہے وہ نشر و اشاعت قرآنی پر صرف ہو جاتی ہے۔ ابھی تک کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اور آج بھی اپنے خرچ پر سفر کی تکالیف برداشت کرتے ہوئے یہاں تشریف لائے ہیں۔ ان کی قرآنی بصیرت کا عام ہونا ہی ان کے لئے اجر و معاوضہ ہے۔

میں آپ کو زیادہ انتظار میں نہیں رکھنا چاہتا۔ اور اس پر اکتفا کرتا ہوں کہ مشک آں است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ میں معزز مہمان سے درخواست کروں گا کہ اسلامی ریاست کے قرآنی تصور، جیسے مشکل اور اہم موضوع پر اپنی قرآنی بصیرت سے حاضرین کو مستفید فرمائیں۔

اس کے بعد پرویز صاحب نے اجتماع سے خطاب کیا۔ اور مختصر لیکن نہایت واضح انداز میں بتایا کہ سیکولر اسٹیٹ اور قرآنی مملکت میں اصولی اور بنیادی فرق کیا ہے اور ان کے نتائج و اثمار کیا۔ یہ خطاب اس قدر بصیرت افروز اور حقیقت کشا تھا کہ سامعین میں سے اکثر نے کہا - کہ اس موضوع پر اس قدر سلجھے اور نکھرے ہوئے انداز میں یہ خیالات پہلی مرتبہ ان کے سامنے آئے ہیں۔

محترم شیخ فیض محمد صاحب، سابق اسپیکر اسمبلی (مغربی پاکستان) وایڈووکیٹ جنرل ڈیرہ غازی خان کے رہنے والے ہیں۔ ناظم ادارہ محترم عبدالرب صاحب کے ہم درس اور پرویز صاحب کے دیرینہ احباب میں سے ہیں۔ وہ ان دونوں کو اپنے ہاں قیام کے لئے لے گئے۔ باقی رفقاء کا قیام میاں محمد اسحٰق بودلہ کے مکان پر رہا۔ یہ جواں بخت میاں محمد سرور (مالک بہک اسٹیٹ، ضلع فیروزپور، مشرقی پنجاب) کے صاحبزادہ ہیں اور نہایت خوش خلق اور متواضع۔ جس خندہ پیشانی اور کشادہ دلی سے انہوں نے میزبانی کا حق ادا کیا اس کے لئے ادارہ ان کا خاص طور پر شکر گزار ہے۔ محترم شیخ فیض محمد صاحب نے اپنے عزیز مہمانوں کی تواضع کے علاوہ، رخصت کے وقت انہیں ایک تحفہ بھی دیا۔ اور وہ یہ کہ طلوعِ اسلام کا پرچہ بارہ مستحق حضرات کے نام سال بھر کے لئے ان کی طرف سے جاری کر دیا جائے۔ ادارہ ان کے اس محبوب تحفہ کے لئے سپاس گزار ہے۔

۸ر مارچ کی صبح، محترم ڈاکٹر صاحب موصوف کے مکان پر درسِ قرآن کا انتظام تھا چونکہ رمضان المبارک کی آمد آمد تھی اس لئے پرویز صاحب نے (اس نسبت سے) قرآن کریم کی عظمت اور بے مثالیت ہی کو درس کا موضوع رکھا۔ آپ سے وہاں کی فضا قرآنی کرنوں سے جس قدر آئینہ پوش ہوئی۔ اس کا اندازہ دیکھنے ہی سے لگایا جا سکتا تھا۔

دوپہر کو بزمِ طلوعِ اسلام ڈیرہ غازی خان کے قائم کردہ دار المطالعہ میں اراکینِ بزم کا اجتماع تھا جس میں شرکاء کی تعداد ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر تھی۔ ڈیرہ غازی خان جیسے دور افتادہ علاقہ میں جو کچھ بزم نے کیا ہے جب اس کی روئداد سامنے آئی تو اس سے اندازہ ہوا کہ ان چند مخلص (اور بظاہر بے سر و سامان) عشاقِ قرآن نے کس محنت اور تندہی سے اس خار و یابس سرزمین میں قرآنی فکر کی تخم ریزی کی ہے۔ جی چاہتا تھا کہ ان احباب کا قارئین طلوعِ اسلام سے نام بنام تعارف کرایا جائے لیکن اس خیال سے کہ اگر بعض احباب کے نام سہواً رہ گئے تو اس کا انہیں (اور ان سے زیادہ خود ہمیں) افسوس ہوگا۔ ان سب کے مجموعی تعارف ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

پرویز صاحب کی آمد کی اطلاع پاکر جھنگ۔ پنج کسی۔ ملتان۔ جام پور اور مظفر گڑھ تک کے احباب ڈیرہ غازیخاں پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے جس جذبہ کے ماتحت سفر کی صعوبات برداشت کیں اس کا ہمارے دل پر گہرا اثر ہے۔ یہ سب قرآن کی کشش کا نتیجہ ہے۔

ساڑھے چار بجے شام میونسپل ہال میں پرویز صاحب کا خطاب عام تھا۔ اگرچہ شرکت کے لئے دعوت نامے جاری کئے گئے تھے لیکن ہال وقت سے بہت پہلے کھچا کھچ بھر گیا تھا اور سامعین کی بہت سی تعداد ہال کے باہر کھڑی تھی۔ محترم شیخ فیض محمد صاحب کی صدارت میں اجتماع ہوا۔ موضوع تقریر "قرآن کا معاشی نظام" تھا۔ قریب ڈیڑھ گھنٹہ تک تقریر جاری رہی اور نہ صرف انھوں نے جو ہال کے اندر بیٹھے تھے بلکہ انھوں نے بھی جو ہال کے باہر کھڑے تھے، جس جذب و انہماک سے اسے سنا اس سے ظاہر تھا کہ اگر قرآن کا پیغام صحیح انداز میں پہنچایا جائے تو مسلمان کے لئے اس سے بڑھ کر کشش و جاذبیت کی کوئی اور آواز نہیں ہو سکتی۔ نماز مغرب کے قریب یہ اجتماع نہایت حسن و خوبی سے اختتام پذیر ہوا۔

شب کو بہت سے مقامی اور بیرونی احباب نجی گفتگو کے لئے جمع ہوئے اور متفرق مسائل پر بات چیت ہوتی رہی۔

اگلی صبح یہ کاروانِ شوق وہاں سے رخصت ہوا۔ واپسی تونسہ کے راستے ہوئی جہاں وہ عظیم الشان بیراج (BARRAGE) دیکھا جس پر ہمارا ملک بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ ملتان اسٹیشن پر وہاں کے احباب آئے ہوئے تھے جن سے چلتے چلتے ملاقات ہو گئی۔ قریب سات بجے شب واپس لاہور پہنچ گئے۔

طلوع اسلام کنونشن

جیسا کہ پہلے اعلان کیا جا چکا ہے "طلوع اسلام کی تیسری سالانہ کنونشن" ۱۹ر-۲۰ر-۲۱ر اپریل (بروز اتوار۔ سوموار۔ منگل وار) بہترین ہاؤس۔ متصل پاکستان منٹ۔ شالامار ٹاؤن۔ لاہور میں منعقد ہو رہی ہے۔

۲۔ بزم ہائے طلوع اسلام کے اراکین کے لئے "کیمپ لائف" ہوگی۔ طعام و قیام کے اخراجات کے لئے بحساب پندرہ روپے فی کس (پیشگی) ادا کرنا ہوگا۔

۳۔ جو حضرات کسی بزم کے رکن نہیں وہ کنونشن میں بہ حیثیت مبصر شریک ہو سکیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کنونشن کی کارروائی میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ ان میں سے جو حضرات قیام و طعام کا اپنا انتظام کر لیں گے ان سے زر

اخراجات نہیں لیا جائے گا۔

۴۔ کنونشن میں شرکت کے لئے باقاعدہ دعوت نامے جاری کئے جائیں گے۔ جن کے بغیر داخلہ نہیں ہو سکے گا۔

۵۔ اراکین ہوں یا مبصرین۔ جن کی درخواست شمولیت (مع زر اخراجات) ۱۵ اپریل تک موصول نہیں ہوں گے وہ کنونشن میں شریک نہیں کئے جا سکیں گے۔

۶۔ جن حضرات کی طرف سے زر اخراجات ۳۱ مارچ تک موصول ہو چکا ہے۔ ان کی خدمت میں دعوت نامے بھیجے جا چکے ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کو ۱۵ اپریل تک دعوت نامہ نہ ملے تو وہ براہ کرم فوراً اطلاع دیں۔

۷۔ ہفتہ (۱۸ اپریل) کی شب کو کنونشن میں شامل ہونے والے حضرات کا تعارفی اجلاس ہوگا۔ اتوار (۱۹ اپریل) کی صبح دس بجے کے قریب پہلا اجلاس ہوگا جس میں محترم پرویز صاحب شرکاء سے خطاب کریں گے۔ منگل دار دوپہر کو کھانے کے بعد کنونشن اختتام پذیر ہو جائے گی۔ تفصیلی پروگرام کا اعلان کنونشن کے افتتاح کے وقت کیا جائے گا۔

۸۔ جو حضرات ہفتہ (۱۸ اپریل) کی شام کو لاہور پہنچ رہے ہوں، وہ براہ کرم ۱۵ اپریل تک مطلع فرما دیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔

۹۔ لاہور سے جو شاہراہ عظیم (گرانڈ ٹرنک روڈ) امرتسر کی طرف جاتی ہے اس پر (شالامار باغ سے کچھ آگے) سڑک کے کنارے پاکستان مینٹ (ٹکسال) ہے۔ مینٹ کے دروازے کے بالکل سامنے سڑک کی دوسری طرف طلوع اسلام کنونشن کا بورڈ آویزاں ہوگا۔

۱۰۔ لاہور اسٹیشن (نیز شہر کے دیگر مختلف مقامات) سے بسیں مینٹ تک آتی ہیں۔

۱۱۔ لاہور شہر کے ریلوے اسٹیشن سے باہر پشاور کی سمت، تھرڈ کلاس کا ریلوے پل ہے۔ اس پل کے دوسری طرف اسٹیشن کے عقب میں، باغبانپورہ کے لئے تانگوں کا اڈہ ہے۔ وہاں سے تانگے دن رات (ہر وقت) مل سکتے ہیں۔ تانگے والے سے کہہ دیا جائے کہ پاکستان مینٹ کے سامنے جانا ہے۔ عام طور پر سالم تانگہ کا کرایہ ایک روپیہ یا ساڑھے روپیہ ہوتا ہے۔

۱۲۔ وسط اپریل میں لاہور میں موسم بڑا خوشگوار ہوتا ہے۔ ہلکے پھلکے کپڑوں (اور بستر) میں گذارہ ہو جاتا ہے۔

۱۳۔ زر اخراجات بنام

محترم عبدالرب صاحب

ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور۔ بھیجا جائے

۱۴۔ اس حقیقت کا دہرا دینا ضروری ہے کہ طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے اور نہ ہی کسی مذہبی فرقہ سے۔ اس کا مقصد قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا عام کرنا ہے اور یہ کنونشن اسی مقصد کا ایک ذریعہ ہے۔

اس وقت ملک میں قرآنی فکر کے عام کرنے کی جس قدر شدید ضرورت ہے اس کے پیش نظر اس کنونشن کی اہمیت کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس لئے اراکین بزم ہائے طلوع اسلام کے لئے ضروری ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں کنونشن میں شریک ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دفعہ کنونشن کو نمائندگان تک ہی محدود نہیں رکھا۔ نمائندگان اور اراکین یکساں طور پر شریک کنونشن ہوں گے۔ البتہ ابتدائی بزموں کے نمائندگان اور ضلع بزموں کے ترجمان حضرات کی شرکت ضروری ہوگی کیونکہ ان کے مشوروں سے بہت سے امور طے پائیں گے۔

---

۶ / مارچ تک برتنوں کی خریداری کے سلسلہ میں حسب ذیل مزید رقوم وصول ہوئی ہیں۔

(۱) بزم کلری (ضلع جھنگ)	۱۰/-	روپیہ
(۲) بزم چنیوٹ	۴۰/-	"
(۳) بزم چونڈہ	۱۰/-	"
(۴) بزم ڈیرہ غازی خاں	۲۰/-	"

باقی باتیں اب کنونشن میں زبانی کی جائیں گی۔

احباب کی آمد کا منتظر

(چوہدری) عبدالرحمٰن (صدر کنونشن کمیٹی)

ادارہ کی طرف سے

نمائندگان بزم کو یاد دہانی کرائی جاتی ہے کہ وہ (۱) یہ طے کر کے آئیں کہ وہ کس قدر پمفلٹ خریدیں گے۔ اور (۲) مطلوبہ رقم اپنے ہمراہ لائیں۔ اس کی بابت اگر پہلے اطلاع دیدیں تو آسانی رہے گی۔ پمفلٹ کنونشن میں ان کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

ماہانہ رپورٹوں کا ملخص

پشاور پرنسپل پبلک سکول کیمبلپور سے محترم پرویز صاحب کی تقریر کے لئے دعوت نامہ حاصل کیا

لٹریچر کی تقسیم جاری ہے۔ اجلاس باقاعدہ ہوئے۔ تعلیم یافتہ اصحاب سے رابطہ قائم کیا۔ محترم پرویز صاحب کے دورۂ پشاور کے لئے کام کیا جا رہا ہے۔

جہلم ایک درجن کتب مختلف اصحاب کو مطالعہ کے لئے دیں اور چودہ پمفلٹ مفت تقسیم کئے۔

جھنگ صدر ابتدائی بزموں کو قریب تر لانے کے لئے سہ ماہی اجلاس کا سلسلہ بزم کلاری سے شروع ہوا۔ ضلع کی تمام ابتدائی بزموں نے شرکت کی۔ بعض نمائندے بارہ بارہ میل پیدل سفر کر کے پہنچے۔ اجلاس دو دن جاری رہے۔ اور ہر بزم کے ذمہ ٹھوس کام لگا کے گئے۔ دیہاتی عوام حقائق قرآنی کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ ضلع کے صدر مقام میں بزم خواتین کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔ رسالے تقسیم کئے گئے

چک ۲۲۸ کتاب "قرآنی فیصلے" میں سے شب برات کا عنوان پڑھ کر سنایا گیا جس سے سامعین بہت متاثر ہوئے اور صحیح تعلیم سامنے لانے کے لئے ادارہ کے شکر گذار ہوئے۔

چنیوٹ۔ ایک سرگرم رکن کے اعزاز میں جو چنیوٹ سے پاک پتن تبدیل ہو گئے ہیں الوداعی دعوت دی گئی۔ ارکان نے ضلع بزم کے جلسہ میں شرکت کے لئے کلاری کا سفر کیا۔ جہاں کا راستہ دشوار گذار ریتلا سیم زدہ اور غیر آباد تھا۔ چھ اراکین کنونشن میں شرکت کریں گے۔ برتنوں کے لئے چالیس روپے صدر کنونشن کمیٹی کو گذشتہ ماہ بھیجے گئے۔

کلاری۔ ضلع بزم کا اجلاس ہوا۔ رسالہ اور پمفلٹ تقسیم کئے اور کتب مطالعہ کے لئے دیں۔ مقامی اسکول میں عربی شروع کرنے کی تحریک کی۔ صدر میں بزم خواتین قائم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تحریک کو بڑھانے کے لئے دیہات کا دورہ کیا گیا۔

حیدرآباد ٹنڈو محمد خاں۔ ٹنڈو آدم کے ایک صاحب کو رکن بنایا گیا۔ کنونشن میں دو رکن شرکت کریں گے۔ فیصلہ کیا گیا کہ پمفلٹ تقسیم کئے جائیں۔ اور طلوع اسلام کی پانچ کاپیاں منگائی جائیں۔

ڈیرہ غازی خاں۔ ابتدائی بزموں کا سب کنونشن منعقد ہوا جس میں محترم پرویز صاحب اور رفقاء نے شرکت کی۔ جناب ملک محمد حیات صاحب ایم ایس کی جانب سے استقبالیہ دعوت میں ایک صد افراد شریک ہوئے جن میں شہر کے معززین۔ ڈاکٹر۔ پروفیسر۔ وکلا اور افسران ضلع کے علاوہ اراکین بزم نے چائے نوش کی۔ میزبان نے پرویز صاحب کا تعارف کرایا اور ان کی درخواست پر موصوف نے "ریاست کا قرآنی تصور" کے عنوان پر ایک گھنٹہ پر مغز تقریر فرمائی۔ تقریر کے بعد سوال و جواب ہوئے۔ نوجوان بزم نے سٹال لگا کر کتب وغیرہ کی فروخت کی۔ اگلی صبح کو ملک صاحب کے دولت کدہ پر درس قرآن ہوا جس میں کثیر تعداد نے شرکت کی۔ خواتین کے لئے پردہ کا انتظام تھا۔ درس کا عنوان

ماہِ رمضان تھا۔ افطار کے بعد پرویز صاحب بزم کے دارالمطالعہ میں تشریف لے گئے۔ وہاں جناب ایم اسمٰعیل شہید صاحب کی درخواست پر سفرِ سیالکوٹ اور علامہ اسلم جیراجپوری سے اپنے تعلقات کا ذکر فرمایا۔ میاں عطاء اللہ صاحب ایم اے نے بزم کی کارگذاری سنائی جس میں نامساعد حالات میں دفتر کا قیام۔ لائبریری کا افتتاح اور دارالمطالعہ کا اجراء شامل تھے۔ تقریباً پانچ سو پمفلٹ مفت تقسیم کئے۔ اور طلوعِ اسلام کی کاپیاں پانچ سے بڑھا کر بائیس کر دی گئی ہیں۔

شام کو ۵ بجے یونین ہال میں پرویز صاحب کی "قرآن اور روٹی کا مسئلہ" پر تقریر ہوئی۔ جناب شیخ فیض محمد صاحب سابق اسپیکر پنجاب اسمبلی و چیف جسٹس بہاولپور و ایڈووکیٹ جنرل نے صدارت کی۔ خواتین نے معقول تعداد میں شرکت کی۔ شیخ صاحب موصوف نے وعدہ فرمایا کہ وہ طلوعِ اسلام کی بارہ کاپیوں کا سالانہ چندہ عنایت فرمائیں گے نیز شیخ ممتاز احمد صاحب نے دو کاپیوں کے سالانہ چندہ کا وعدہ فرمایا۔

مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام شیخ فیض محمد صاحب اور جناب محمد اسحٰق صاحب لودھی نے فرمایا۔

راولپنڈی۔ مری میں رسالہ پہنچانے کا انتظام کیا۔ وہاں قیامِ بزم کی جلد توقع ہے۔ سولہ احباب کنونشن میں شرکت کریں گے۔ پمفلٹوں کی تقسیم کا پروگرام بنایا۔ جلسہ میں سلیم کے نام خط بعنوان "عمل بالاحادیث" پڑھا گیا۔

سرگودھا، چک جھمرہ۔ شہر سرگودھا میں بارہ کتب احباب کے زیرِ مطالعہ ہیں۔ بھلوال میں بھی کتابیں پڑھی جا رہی ہیں۔ چک ۱۲/۲۴۴ جنوبی سے دو صاحبان تشریف لائے۔ وہ شعلہ مستور پڑھنے کے لئے لے گئے۔ چک ۲۴ شمالی کے امام مسجد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھیں ادارہ کے لٹریچر سے بہت وابستگی ہے۔ مقامی احباب کو مارچ کا رسالہ سنایا گیا۔ سرگودھے کے مولوی صاحبان کوشش کر رہے ہیں کہ پرویز صاحب کے دورہ سے جو اچھا اثر پیدا ہوا ہے اسے زائل کیا جائے۔ لیکن وہاں رسالہ زیادہ مقبول ہو رہا ہے۔ دورہ کی تاریخوں میں اچانک تبدیلی سے بیرون جات کے جو احباب مستفید نہیں ہو سکے تھے وہ افسوس کا اظہار برابر کرتے ہیں۔

سیالکوٹ شہر۔ ہفتہ وار اجتماعات میں قرآنی نظامِ ربوبیت پر گفتگو ہوئی اور خلافِ قرآن چند روایات کی تردید کی گئی۔

چونڈہ۔ دو اراکین کنونشن میں شرکت کریں گے برتنوں کے لئے دس روپے بھیجے گئے۔ کتابیں سلسلے اور

پمفلٹ تقسیم کئے گئے۔

شیخوپورہ ۔ دس روپے کے پمفلٹ دستی اور بذریعہ ڈاک تقسیم کئے۔

کراچی ۔ ہفتہ وار اجتماعات ہوئے۔ دستورِ پاکستان اور طلوعِ اسلام کا انگریزی پمفلٹ ایک ہزار منگایا گیا اور تقسیم کیا جا رہا ہے۔ ٹیپ ریکارڈر کی خرید کی کوشش جاری ہے۔ کم از کم دس اصحاب کنونشن میں شرکت کریں گے۔ گورنمنٹ ٹیکنیکل ہائی سکول کراچی کو لٹریچر کا ایک سیٹ پیش کیا۔ ناظم آباد میں لائبریری کھولی گئی۔ پمفلٹوں کی تقسیم کے علاوہ شیر شاہ کی لائبریری نے بیالیس احباب کو اور برنز لائن کی لائبریری نے گیارہ اصحاب کو کتب مطالعہ کے لئے دیں۔

کوہاٹ ہنگو۔ دو اراکین کنونشن میں شرکت کریں گے۔ ہفتہ وار اجلاس ہوئے۔ جن میں تعلیم یافتہ اصحاب نے شرکت کی۔ ادارہ سے پچاس عدد فارم رکنیت طلب کئے۔

لائلپور ۔ دو سو سے زیادہ پمفلٹ تقسیم کئے۔

مردان شہر۔ ریاست سوات کے ایک مولوی صاحب کے نام طلوعِ اسلام جاری کرایا گیا۔ ایک صاحب کو گذشتہ دو ماہ سے لٹریچر بھیجا جا رہا تھا۔ اب وہ طلوعِ اسلام کے خریدار بن گئے ہیں۔ لٹریچر کی تقسیم جاری ہے۔

مظفر گڑھ محترم پرویز صاحب کا ڈیرہ غازی خاں جاتے ہوئے مظفر گڑھ میں مختصر قیام اور لنچ بہت موثر ثابت ہوئے۔ گذشتہ تعطل دور ہو کر ارکان میں نئی روح پیدا ہو گئی ہے۔

ملتان ۔ پنج کسی۔ مختلف کتب احباب کے زیرِ مطالعہ ہیں۔ ملتان میں قیامِ بزم کی کوشش جاری ہے۔ چک ۹۶/۱۰-۱۵ ایل کے محترم حکیم محمد علی صاحب سے رابطہ قائم کیا جنہیں تحریک سے بہت دلچسپی ہے۔ نمائندہ بزم نے دیہاتی بچوں کے موقع پر ارزاں ادویات تقسیم کیں۔ اراکین نے ڈپو سے غلہ حاصل کرنے میں نادار اشخاص کی دستگیری کی۔

منظور شدہ بزمیں

حسبِ ذیل مزید بزموں کو منظور شدہ تصور کیا جائے۔

نمائندہ	ابتدائی بزم
شیر محمد مہاجر صاحب	چک ۱۹۸ ج ب ضلع جھنگ
محمد نذیر اللہ نیازی صاحب	واہ چھاؤنی

ضرورتِ رشتہ

ایک ایم۔ اے پاس سلیقہ شعار، پابندِ دین اچھے گھرانے کی لڑکی کیلئے موزوں رشتے کی تلاش ہے۔ ضرورت مند اصحاب م۔ ح معرفت ادارہ طلوعِ اسلام سے خط و کتابت کریں۔

بابُ المراسلات

محترم سیّد نذیر نیازی صاحب کا گرامی نامہ

مدیر طلوعِ اسلام کے نام

مکرمی۔ السلام علیکم۔ اجازت دیجئے کہ طلوعِ اسلام کی تازہ (مارچ ۵۹ء) کی اشاعت میں آپ نے تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ کے اردو ترجمے پر تبصرہ کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کے متعلق چند ایک معروضات پیش کر سکوں۔

آپ کا ارشاد ہے کہ خطبات کا ترجمہ سلیس زبان میں تو ممکن نہیں تھا لہٰذا بہتر ہوتا کہ اس میں تصریحات اور حواشی کا بکثرت اضافہ کر دیا جاتا تاکہ ہر مبحث تمام و کمال سمجھ میں آ سکتا۔ آپ کی یہ بھی رائے ہے کہ تصریحات اور حواشی عجلت یا پریشانی میں لکھے گئے اور یہ بھی بہت کم ورنہ ترجمہ زیادہ مفید ثابت ہوتا۔ آپ کا خیال اپنی جگہ پر ٹھیک ہے لیکن اتنا تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ حواشی اور تصریحات کو متن سے کوئی معقول نسبت ہونی چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا عجلت میں تو نہیں البتہ پریشانی میں ضرور لکھا۔ کچھ بباعث ذاتی حالات اور کچھ اس مشکل کی وجہ سے جس کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا کہ خطبات کے مطالب پر الگ قلم اٹھایا جائے یا یہ کہ ایک حد تک مقدمے، حواشی اور تصریحات ہی میں ان کی وضاحت کر دی جائے۔

بہرحال آپ جس چیز کا مطالبہ کر رہے ہیں اس کے لئے ایک جداگانہ تصنیف کی ضرورت ہے اور میں خود بھی سمجھتا ہوں کہ حضرت علامہ نے یہ خطبات جس مقصد کے پیشِ نظر ترتیب دیئے تھے اس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ مگر یہ کام جیسا کہ آپ نے لکھا ہے دل جمعی سے کرنے کا ہے۔ اس کے لئے بڑی محنت اور وقت کی ضرورت ہے اور اس لئے سرِدست تو میں اپنے آپ میں اس کی استطاعت نہیں پاتا۔ ہاں اگر اس کام کو میری یا آپ کی ذاتی کوشش کی بجائے ایک مقصد سمجھ کر ہاتھ میں لیا جائے تو پھر میں بھی اپنی بساط کے مطابق حاضر ہوں۔

زیادہ نکتہ جس کی طرف آپ نے خطبات کے اصل موضوع کے پیش نظر اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ ادراک بالحواس کے علاوہ کیا علم کا اور بھی کوئی سرچشمہ ہے۔ سو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ کیوں نہیں۔ آپ خود بھی وحی کے (بطور سرچشمہ علم) قائل ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ کے نزدیک حصولِ علم کا یہ ذریعہ صرف انبیاء علیہم السلام کی ذات سے مختص تھا۔ لہٰذا ختم نبوت کے ساتھ اس کا سلسلہ بھی ہمیشہ کے لئے منقطع ہو گیا۔

اندریں صورت ہمارے آپ کے درمیان موضوع گفتگو کیا ہو گا؟

ا ۔۔۔ یہ کہ ادراک بالحواس کے علاوہ علم کا کوئی اور ذریعہ بھی ہے یا علم کے لئے بہر حالت ادراک بالحواس شرط ہے۔

ب ۔۔۔ یا یہ کہ قرآن مجید کے نزدیک علم کی تعریف ہے علم بالحواس اور اس لئے ادراک بالحواس کے علاوہ اس کے نزدیک علم کا کوئی ذریعہ نہیں۔

آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت علامہ کے نزدیک انبیاء اور صوفیہ کے علم میں باعتبار کیفیت و ماہیت کوئی فرق نہیں۔ آپ کا یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حضرت علامہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انبیاء کا علم حتمی اور یقینی ہوتا ہے۔ اس میں غلطی اور خطا کی مطلق گنجائش نہیں ہوتی۔ برعکس اس کے صوفیہ کا علم ناقص بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ اس میں فریب کا بھی امکان ہے بعینہٖ جیسے علم بالحواس میں۔ پھر جہاں انبیاء کا علم سب سے پہلے ان کی اپنی ذات اور پھر سب کے لئے حجت ہے صوفیہ کا علم ان کی اپنی ذات کے لئے بھی حجت نہیں دوسروں کا کیا کہنا۔ آپ نے اس سلسلے میں جس فرق کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا تعلق اس علم کے عملی نتائج سے ہے جو انبیاء کو بذریعہ وحی اور صوفیہ کو مشاہدات باطن کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

میرا خیال ہے آپ نے شاید تصوف اور ارباب تصوف یعنی حضرات صوفیہ اور صوفیانہ واردات کے علاوہ مشاہدات باطن (Inner Experiences) کے متعلق حضرت علامہ کے ارشادات پر غور نہیں کیا ورنہ یہ غلط فہمی کہ حقیقت مطلقہ کے عقلاً ادراک اور باطناً مشاہدے کا مسئلہ غیر واضح رہ گیا پیدا نہ ہوتی۔ ضمناً یہ عرض کر دینا بھی غیر مناسب نہ ہو گا کہ حضرت علامہ نے ان خطبات میں ایک ایسی حقیقت سے بحث کی ہے جو ایک امر واقعی بھی ہے اور جس کی تاریخ بھی تصدیق و تائید کرتی ہے یعنی باطنی واردات سے تاکہ ہم از روئے علم اور عقل و فکر ان کی ماہیت اور قدر و قیمت کا اندازہ کر سکیں۔ حضرت علامہ نے اپنی کوئی واردات پیش نہیں کیں، نہ ان کی بنا پر کوئی دعوے کیا ہے جس سے بقول آپ کے اس قسم کے الحاد، زندقہ، کا اندیشہ ہو جیسے حضرت علامہ نے کبھی فصوص الحکم کا حاصل قرار دیا تھا۔

مخلص نیازی

طلوع اسلام ہمیں خوشی ہوئی کہ محترم نیازی صاحب نے ہماری گزارشات کو درخور اعتنا سمجھا۔ ہم ان کی توجہ فرمائی کے لئے شکر گزار ہیں۔ یہ معلوم کر کے بھی خوشی ہوئی کہ انہیں بھی ایک ایسی تصنیف کی ضرورت اور

اہمیت کا احساس ہے جس سے حضرت علامہؒ کے عمیق اور بلند افکار کی وضاحت ہو جائے خدا کرے انھیں اس کے لئے جمعیت خاطر نصیب ہو جائے۔ اس قسم کے کام افراد کے بجائے اداروں کے کرنے اور کرانے کے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کے ادارے جو "اقبال" کے نام پر قائم ہیں، ان کے مقاصد اور مساعی کے نتائج سے کون واقف نہیں۔

(۲) شاہدات باطن یا باطنی واردات کا مسئلہ بڑا اہم ہے اور چونکہ محترم نیازی صاحب اس پر تفصیلی گفتگو کرنے کے لئے آمادہ نظر آتے ہیں اس لئے انھوں نے جو کچھ اپنے گرامی نامہ میں اس ضمن میں لکھا ہے، ہم اس پر تبصرہ اور تنقید کو تفصیلی گفتگو کے موقع پر اٹھا رکھنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں۔ اس باب میں ہمارے نزدیک موضوع گفتگو یہ ہوگا۔

(۱) ایک علم وہ ہے جو حضرات انبیاء کرام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا تھا۔ یعنی منزل من اللہ علم۔ اس کی آخری مثال قرآن کریم ہے۔

(۲) ایک علم وہ ہے جو حواس کے ذریعے عام انسانوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اس میں مطالعۂ فطرت۔ انسانی تجربات (تاریخ)، انسانی عقل و فکر وغیرہ شامل ہیں۔

(۳) جس چیز کو صوفیائے کرام کا مشاہدۂ باطن یا واردات باطنی کہا جاتا ہے کیا وہ علم کی تیسری اور الگ نوعیت ہے یا اس کی اور اول الذکر علم کی نوعیت ایک ہی ہے۔

(۴) قرآن کریم سے شق ۱ اور ۲ کے علوم کی سند ملتی ہے۔ اگر شق ۳ الگ نوع کا علم ہے تو کیا قرآن سے اس کی بھی سند ملتی ہے۔؟

(۵) اگر شق ۳ اور شق ۱ کے علوم کی نوعیت ایک ہی ہے تو (ا) اس میں اور نبی کے علم منزل من اللہ میں فرق کیا ہوتا ہے۔ اور (ب) کیا اس کی سند قرآن سے ملتی ہے؟

اس ضمن میں حسب ذیل نکات کا سامنے رکھنا ضروری ہوگا۔

(i) گفتگو قرآن کریم کے اندر رہ کر کی جائے گی۔ اس لئے کہ اصل سوال ہی یہ ہے کہ کیا قرآن سے اس قسم کے باطنی علم کی تائید ملتی ہے؟

(ii) اگر حضرات انبیاء کرام کی طرف علم منزل من اللہ کے لئے وحی کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس میں اور نحل کی طرف وحی اور ام موسیٰ (وغیرہ) کی طرف وحی میں التباس نہ پیدا کیا جائے۔

(iii) ہپناٹزم (وغیرہ) کی بحث کو درمیان میں نہ لایا جائے۔ نہ ہی اُن کیفیات کو جو ہمیں جذبات کی رُو سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ مباحث جداگانہ ہیں۔

آخر میں ہم اتنا اور عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اس گفتگو سے مقصد مباحثہ اور مناظرہ قطعاً نہیں۔ اس سے مقصد صرف یہ ہے کہ ایک اہم علمی (یا دینی) مسئلہ کی وضاحت ہو جائے۔

ہم محترم نیازی صاحب کی طرف سے آغاز گفتگو کے منتظر رہیں گے۔

روزہ کے احکام

روزہ سے متعلق احکام کے سلسلہ میں (جو مارچ ۵۹ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوئے ہیں)، ایک صاحب نے لکھا ہے کہ ان میں یہ تو بتایا ہی نہیں گیا کہ روزہ کس وقت سے شروع ہوتا ہے اور کب ختم ہوتا ہے۔

طلوع اسلام۔۔۔ قرآن کریم میں ہے۔ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ (۲/۱۸۷) اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ فجر کی سفید دھاری تمہارے لئے سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے، پھر رات تک روزہ پورا کرو۔ یعنی قرآن کی رو سے روزہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب رات کی سیاہ دھاری اور فجر کی سفید دھاری بالکل نمایاں ہو جائے۔ باقی رہا لیل کا سوال تو جب دن ختم ہو جاتا ہے اس وقت رات شروع ہو جاتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دن شروع ہوتا ہے طلوع آفتاب سے اور ختم ہوتا ہے غروب آفتاب پر۔ یعنی جب لیل ختم ہوتی ہے تو نہار شروع ہو جاتا ہے اور جب نہار ختم ہو جاتا ہے تو لیل شروع ہو جاتی ہے۔

کھانے پینے کے علاوہ روزے میں دن کے وقت اَلرَّفَثُ إِلَى النِّسَاءِ (جنسی اختلاط) بھی منع ہے۔

طاہرہؓ کے نام

جس میں عورتوں کی زندگی کے متعلق مختلف سوالات کا جواب ہلکے پھلکے اور خوبصورت انداز میں سامنے آجاتا ہے۔ لڑکیوں کی اسلامی تعلیم کیلئے بڑا دلچسپ نصاب ہے

جلد اوّل:۔ دو روپے — جلد دوم:۔ ڈھائی روپے

ملنے کا پتہ:۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵۔بی۔ گلبرگ۔ لاہور

چند بصیرت افروز کتابیں

شعلۂ مستور
محترم پرویز صاحب نے قرآن اور تاریخ کی روشنی میں جناب مسیح کی زندگی کی حقیقی تصویر پیش کی ہے جس میں آپ کی پیدائش، ابتدائی زندگی، دعوت، آپ کے خلاف سازش، ہجرت وغیرہ کے واقعات کے علاوہ عیسائیت کے غلط عقائد، الوہیت، ابنیت، کفارہ وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ضخامت پونے تین سو صفحات۔ قیمت ۵/۸/۰

جمع القرآن
شیخ عطاء اللہ (گجراتی) مرحوم کی بصیرت افروز تالیف جس میں انہوں نے خود قرآن کریم سے یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن نبی اکرمؐ کی زندگی میں موجودہ شکل میں جمع اور مرتب ہو چکا تھا اور آج تک اسی طرح محفوظ چلا آرہا ہے۔ ضخامت اسّی صفحات (طلوعِ اسلام کا سائز) ٹائیٹل کور کے ساتھ۔ قیمت۔ ایک روپیہ۔

اسبابِ زوالِ امت
(دوسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہماری نکبت و زوال کے اسباب کیا ہیں اور ان کا علاج کیا؟ قیمت دو روپے

اسلامی معاشرت
(تیسرا ایڈیشن) مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کے لئے قرآنی ارشادات۔ بالخصوص عورتوں بچوں اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لئے اس سے بہتر کتاب آپ کو نہیں مل سکے گی۔
قیمت:۔ دو روپے

قرآنی فیصلے
روزمرہ زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں۔ دین کے متعلق پُر از معلومات اور حقیقت کشا کتاب ہے۔ ۴۰۸ صفحات۔ قیمت چار روپے

من و یزداں
خدا اور بندے کا باہمی تعلق کیا ہے۔ تقدیر کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ دعا کسے کہتے ہیں اور یہ کس طرح اثر کرتی ہے۔ ضخیم کتاب قیمت مجلد دس روپے

نظامِ ربوبیت
سرمایہ دارانہ نظام کی تباہ کاریاں۔ اشتراکیت کی انسانیت کش ہرزہ بانیاں۔ دین کا مقصود و منتہی۔ اسلام کی غرض و غایت۔ عصر حاضر کی عظیم کتاب۔ قیمت چار روپے

ابلیس و آدم
انسان، آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس، شیطان، جنات، وحی، نبوت، رسالت جیسے اہم عنوانات پر بصیرت افروز تصنیف۔ قیمت آٹھ روپے

اس پتہ سے منگوائیے:۔ **ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/ بی گلبرگ کالونی لاہور**

اسلام کی صحیح تعلیم سمجھنے کیلئے

ان کتابوں کا مطالعہ کیجئے

معراجِ انسانیت

(یعنی سیرت نبی اکرم قرآنی آئینہ میں)

صفحات ۸۳۲ - بڑی تقطیع مجلد گردپوش دبیز - قیمت بیس روپے

برقِ طور

صاحب ضرب کلیم (علیہ السلام) اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی عبرت آموز داستان۔ ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری کی لعنت کے خلاف جہاد عظیم۔

ضخامت ۳۲۰ صفحات - بڑی تقطیع - قیمت مجلد گردپوش چھ روپے

اسلامی نظام

اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں محترم پرویز صاحب اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات کا مجموعہ۔ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔

ضخامت ۱۸۰ صفحات - قیمت دو روپے

اس پتہ سے منگوائیے۔ **ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ کالونی۔ لاہور**